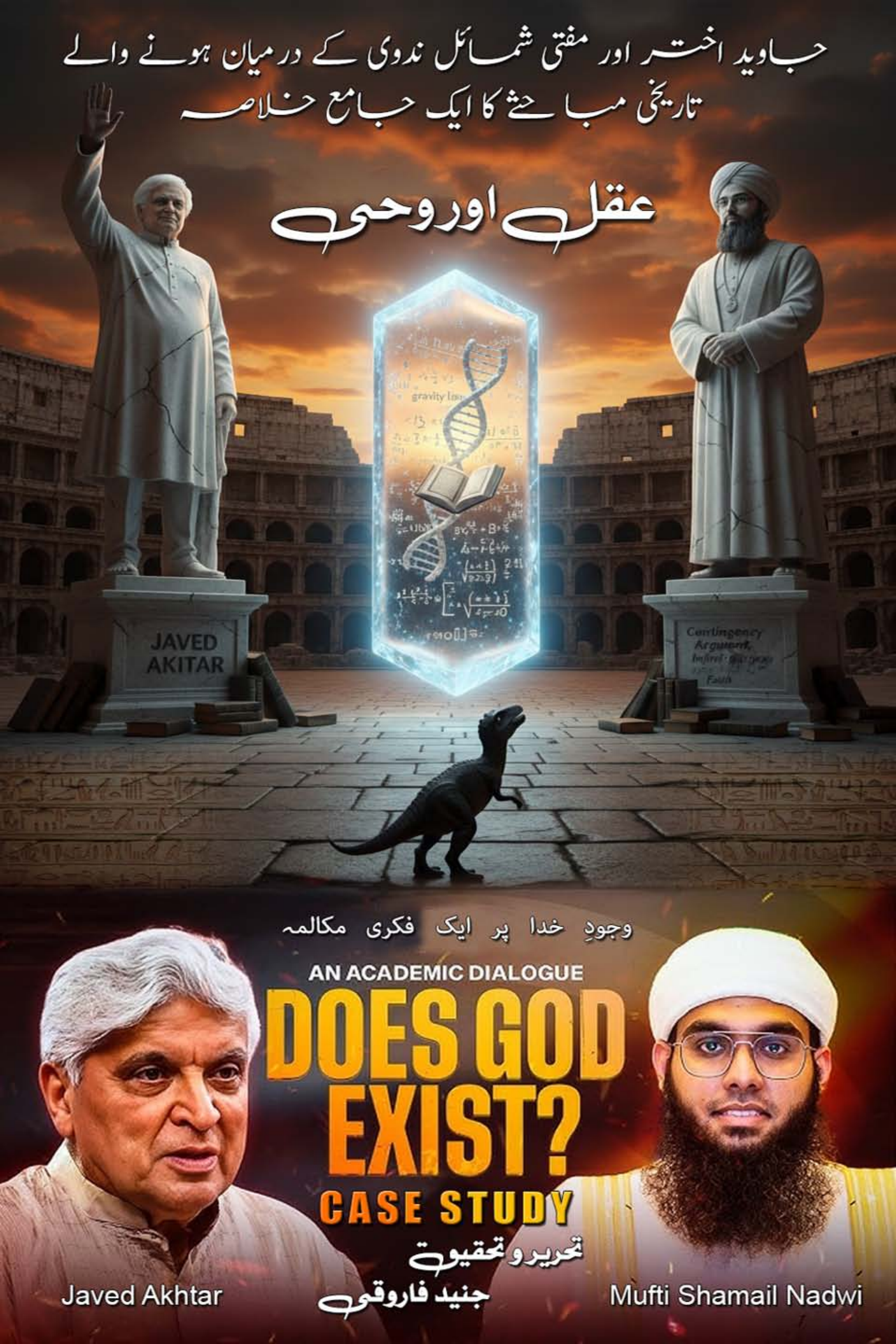

جاوید اختر اور مفتی شمائل ندوی کے درمیان ہونے والے
تاریخی مباحثے کا ایک جامع خلاصہ
عقل اور وحی
JAVED AKITAR
Contingency Argument,
Faith
وجودِ خدا پر ایک فکری مکالمہ
AN ACADEMIC DIALOGUE
DOES GOD EXIST?
CASE STUDY
تحریر و تحقیق
جنید فاروقی
Javed Akhtar
Mufti Shamail Nadwi

جاوید اختر اور مفتی شمائل ندوی کے درمیان ہونے والے

تاریخی مباحثے کا ایک جامع خلاصہ

عقل اور وحی

وجودِ خدا پر ایک فکری مکالمہ

جاوید اختر

VS

مفتی شمائل ندوی

تحریر، تحقیق و تجزیہ

جنید فاروقی

مجوزہ فہرستِ ابواب

باب ہشتم

مذہب: رحمت یا زحمت؟

- تاریخی غلط استعمال
- مذہب بطور اخلاقی بنیاد
- سماجی نظم اور آخری انصاف

اختتامی باب

عقل، ایمان اور مکالمہ ۔ ایک فکری بازگشت

- نتیجہ نہیں، Reflection
- قائل کرنا مقصد نہیں
- بہتر سوال پیدا کرنا کامیابی

مقدمہ

یہ Case Study کسی مناظرے کی روداد نہیں ہے اور نہ ہی کسی فرد کو شکست دینے کی کوشش ہے۔ یہ ایک فکری سفر ہے۔ سفر ایسے سوالات کا جو انسان صدیوں سے خود سے پوچھتا آیا ہے:

- کیا یہ کائنات محض حادثہ ہے یا معنی رکھتی ہے؟
- کیا عقل ہی آخری میزان ہے یا اس کے بھی حدود ہیں؟
- اور اگر خدا کو مانا جائے تو کیا وہ صرف ایک تصور ہے یا ایک زندہ حقیقت جو انسان کی زندگی کو بدل دیتی ہے؟

جدید دور میں خدا کے وجود پر بحث ایک بار پھر شدت اختیار کر چکی ہے۔ سوشل میڈیا، ٹیلی وژن اور عوامی مکالموں میں یہ سوال نئے لہجوں، نئی مثالوں اور نئے دعووں کے ساتھ سامنے آ رہا ہے۔ جاوید اختر اور مفتی شمائل ندوی کے درمیان ہونے والا مکالمہ اسی سلسلے کی ایک نمایاں کڑی ہے۔ ایک ایسا مکالمہ جس نے لاکھوں لوگوں کو سوچنے پر مجبور کیا۔

اس Case Study کا مقصد یہ جانچنا نہیں کہ اس مکالمے میں کون جیتا اور کون ہارا۔ بلکہ اصل مقصد یہ سمجھنا ہے کہ:

- کون سے دلائل مضبوط تھے؟
- کون سے سوالات درست فریم میں تھے؟
- اور کہاں جذبات، اسلوب یا مفروضات نے عقل کو متاثر کیا؟

یہ Case Study ایمان کو عقل کے مقابل نہیں کھڑا کرتی، نہ ہی عقل کو ایمان کا دشمن بناتی ہے۔ بلکہ یہ دکھانے کی کوشش کرتی ہے کہ انسانی شعور میں عقل اور ایمان دونوں کی اپنی اپنی جگہ ہے۔ اور دونوں کو ان کی حدود میں رکھنا ہی فکری دیانت ہے۔

یہ مطالعہ خاص طور پر ان نوجوانوں کے لیے ہے جو:

- سوال پوچھنے سے نہیں گھبراتے
- مگر سوال کو دشمن نہیں بناتے
- اور سچ کی تلاش میں دلیل، اخلاق اور وقار تینوں کو ساتھ لے کر چلنا چاہتے ہیں

اگر یہ Case Study پڑھنے والے کو کسی حتمی جواب تک نہ بھی پہنچا سکے، مگر اسے بہتر سوال پوچھنے کے قابل بنا دے، تو یہی اس کی کامیابی ہوگی۔

جنید فاروقی

ایک سوال، دو نقطۂ نظر: فکری مکالمے کا منظرنامہ

انسانی تاریخ میں کچھ سوال ایسے ہیں جو صدیوں سے زندہ ہیں، نہ اس لیے کہ ان کے جوابات نہیں ملے، بلکہ اس لیے کہ ہر دور انہیں اپنے فکری سانچے میں دوبارہ دیکھتا ہے۔ **"کیا خدا موجود ہے؟"** ایسا ہی ایک سوال ہے۔ ایک سادہ سا سوال، مگر اس کے اندر کائنات جتنی گہرائی پوشیدہ ہے۔ یہ سوال نہ صرف مذہب کا ہے، نہ صرف فلسفے کا، اور نہ ہی محض سائنس کا۔ یہ سوال دراصل **انسان کی عقل، اس کے تجربے، اس کے خوف، اس کی امید، اور اس کے معنی کی تلاش** کا مشترکہ اظہار ہے۔ اسی سوال کے گرد یہ باب ایک ایسے فکری منظرنامے کو واضح کرتا ہے جہاں دو نمایاں زاویے آمنے سامنے آتے ہیں۔

ایک وہ جو کہتا ہے: **"میں وہی مانتا ہوں جو عقل اور تجربہ ثابت کریں"**

اور دوسرا وہ جو جواب دیتا ہے: **"عقل قیمتی ہے، مگر خود اپنی حدود کا اعتراف بھی عقل ہی کی دلیل ہے"**

یہ باب کسی عدالتی کمرے کا نقشہ نہیں جہاں ایک فریق جیتے اور دوسرا ہارے۔ یہ ایک **فکری میدان** ہے، جہاں سوالات رکھے جاتے ہیں، مفروضات کھولے جاتے ہیں، اور دلیل کو دلیل کے ذریعے پرکھا جاتا ہے۔

جاوید اختر اس مکالمے میں اس ذہن کی نمائندگی کرتے ہیں جو جدید انسان کے تجربے سے جڑا ہوا ہے۔ میڈیا، سائنس، عقلِ عام، اور Empiricism پر اعتماد رکھنے والا ذہن۔ ان کے سوالات دلکش بھی ہیں اور پریشان کن بھی، کیونکہ وہ اس انسان کی آواز ہیں جو ماننے سے پہلے سمجھنا چاہتا ہے۔

مفتی شمائل ندوی اس کے مقابل ایک مختلف روایت کے نمائندہ ہیں، وہ روایت جو عقل کو رد نہیں کرتی، مگر عقل کو **حتمی عدالت** بنانے سے انکار کرتی ہے۔ ان کا اسلوب مناظرانہ نہیں، بلکہ سوال در سوال کے ذریعے پڑھنے والے کو خود اپنے مفروضات پر غور کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ یہاں اصل کشمکش **عقل بمقابلہ ایمان** نہیں، بلکہ یہ سوال ہے کہ:

- *عقل کہاں تک ہماری رہنمائی کر سکتی ہے؟*
- *اور جب عقل رک جائے، تو کیا خاموشی ہی واحد راستہ ہے، یا کوئی اور در بھی کھلتا ہے؟*

یہ باب اسی فکری کشمکش کو تہذیب، شائستگی اور علمی دیانت کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ نہ یہاں طنز کو فتح سمجھا گیا ہے، نہ ایمان کو سوال سے بالا رکھا گیا ہے۔ بلکہ پڑھنے والے کو دعوت دی گئی ہے کہ وہ:

- دلیل کو سمجھے،
- ایمان کے دائرے کو پہچانے،
- اور یہ طے کرے کہ **معنی (Meaning)** صرف مادّے سے پیدا ہوتا ہے یا کسی ماورائی حقیقت کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے۔

یہی اس باب کا اصل مقصد ہے: **جیت یا ہار نہیں، بلکہ فہم۔**

موجودہ دور میں "Does God Exist" کے موضوع کی اہمیت

آج کے دور میں خدا کے وجود پر بحث صرف مذہبی یا فلسفیانہ دائرے تک محدود نہیں رہی، بلکہ یہ میڈیا، تعلیم، اور عوامی مکالموں کا حصہ بن گئی ہے۔

- جدید دنیا میں ٹی وی، یوٹیوب، اور سوشل میڈیا پلیٹ فارمز پر ایسے پروگرام عام ہیں، جہاں معروف مفکرین اور علماء ایک دوسرے سے مکالمہ کرتے ہیں۔
- مثال کے طور پر جاوید اختر بمقابلہ مفتی شمائل ندوی کا پروگرام لاکھوں افراد نے دیکھا، اور یہ بحث نہ صرف عوامی دلچسپی کا باعث بنی بلکہ لوگوں کو سوچنے پر مجبور بھی کیا۔

اہم نکات:

1. **عوامی اثر:**
   - ایسے مکالمے لوگوں کے ایمان، شک اور فکری ترقی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔
   - لوگ نہ صرف دلائل سنتے ہیں بلکہ خود اپنی عقل، Faith، اور منطق کے ذریعے ان کا تجزیہ بھی کرتے ہیں۔
2. **علمی اور فلسفیانہ اثر:**
   - مکالمے صرف عقلی اور فلسفیانہ دلائل کا تبادلہ نہیں ہیں بلکہ یہ لوگوں کو Contingency Argument، Infinite Regress، اور Faith کی گہرائی پر غور کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔
3. **زندگی اور کائنات کی سمجھ:**
   - مسئلہ صرف یہ نہیں کہ "خدا موجود ہے یا نہیں" بلکہ یہ بھی اہم ہے کہ انسان کس طرح عقل، **Faith**، منطق اور تجربے کو استعمال کر کے زندگی اور کائنات کے راز سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔
   - یہ مکالمے انسان کو اپنے محدود علم اور حواس کی حدود کا ادراک کراتے ہیں، اور **Faith** کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہیں۔

مثال:

- جاوید اختر سوال کرتے ہیں: "اگر خدا ہے تو دنیا میں اتنی مصیبتیں کیوں ہیں؟"
- مفتی شمائل ندوی جواب دیتے ہیں: "مصائب خدا کی عدم موجودگی کا ثبوت نہیں، بلکہ یہ انسان میں صحیح اور غلط کے احساس کو ظاہر کرتے ہیں۔"
- یہ مکالمہ نہ صرف عقلی ہے بلکہ عملی اور انسانی تجربے سے بھی جڑا ہوا ہے۔

فکری مکالمے کا پس منظر اور تاریخی اہمیت

(A Contemporary Intellectual Dialogue)

یہ فکری مکالمہ 20 دسمبر 2025 کو دہلی، بھارت میں واقع **کانسٹیٹیوشن کلب** کے معزز فورم پر منعقد ہوا۔ گفتگو کا وقت صبح 11 بجے سے دوپہر 1 بجے تک مقرر تھا۔ اس علمی نشست کا اہتمام **وحیین فاؤنڈیشن** اور **اکیڈمک ڈائیلاگ فورم** کے باہمی اشتراک سے کیا گیا، جبکہ معروف صحافی اور دانشور **سوربھ دویدی** نے اس کی نظامت کے فرائض انجام دیے۔

یہ نشست روایتی معنوں میں مناظرہ نہیں تھی، جہاں مقصد ایک فریق کی فتح اور دوسرے کی شکست ہو، بلکہ یہ ایک سنجیدہ، مہذب اور فکری مکالمہ تھا جس میں دو مختلف فکری زاویوں نے ایک بنیادی انسانی سوال پر گفتگو کی: **کیا خدا کا وجود عقل، تجربہ اور معنی کے پیمانوں پر ثابت ہو سکتا ہے؟**

موضوع کی نوعیت نہایت حساس، گہری اور عالمی سطح پر زیرِ بحث ہونے کے باعث اس مکالمے کو غیر معمولی عوامی اور علمی توجہ حاصل ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ اس گفتگو کو محض ایک وقتی میڈیا ایونٹ کے طور پر نہیں دیکھا گیا، بلکہ اسے ایک ایسی فکری دستاویز سمجھا گیا جو عصرِ حاضر کے ذہنی اور تہذیبی سوالات کی عکاسی کرتی ہے۔ اسی علمی اہمیت کے پیشِ نظر، اس مکالمے کو **کتابی صورت میں محفوظ کرنا ایک فکری ضرورت** بن گیا، تاکہ آنے والی نسلیں اس گفتگو کو محض بیانات کے مجموعے کے طور پر نہیں، بلکہ ایک سنجیدہ **Case Study** کے طور پر پڑھ سکیں۔ جس میں عقل، ایمان، فلسفہ، اخلاق اور سماج کے باہمی تعلق کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

بارِ ثبوت کس پر ہے؟ دعویٰ، انکار اور شک
ایک فلسفیانہ تجزیہ

فلسفیانہ مباحث میں سب سے بنیادی مگر اکثر نظر انداز کیا جانے والا سوال یہ نہیں ہوتا کہ **کون درست ہے**، بلکہ یہ ہوتا ہے کہ **دعویٰ کون کر رہا ہے اور بارِ ثبوت کس پر عائد ہوتا ہے۔** خدا کے وجود پر ہونے والی ہر سنجیدہ بحث اسی مقام سے شروع ہونی چاہیے۔

جاوید اختر کا موقف: دعویٰ کرنے والا ثبوت دے

جاوید اختر کا استدلال جدید مغربی فلسفے، خصوصاً تجربیت (Empiricism) اور تشکیّت (Skepticism) سے ماخوذ ہے۔ ان کے مطابق: **"جو چیز دعویٰ کی صورت میں پیش کی جائے، اس کے ثبوت کی ذمہ داری بھی اسی پر ہوتی ہے جو اسے پیش کرتا ہے۔"**

اسی مؤقف کو واضح کرنے کے لیے وہ برطانوی فلسفی **برٹرینڈ رسل** کی مشہور مثال پیش کرتے ہیں:

"اگر میں یہ دعویٰ کروں کہ نظامِ شمسی میں ایک چائے دانی سورج کے گرد گردش کر رہی ہے، تو اس دعوے کو غلط ثابت کرنا دوسروں کی ذمہ داری نہیں، بلکہ اس کا ثبوت فراہم کرنا میری ذمہ داری ہے۔"

اس مثال کے ذریعے جاوید اختر یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ:

- **چونکہ مذہب خدا کے وجود کا دعویٰ کرتا ہے،**
- **لہٰذا مذہب پر لازم ہے کہ وہ اس دعوے کا قابلِ قبول ثبوت فراہم کرے،**
- **اور اگر ایسا نہ کیا جا سکے تو خدا کے وجود کو رد کرنا عقلی طور پر درست ہے۔**

بظاہر یہ دلیل نہایت سادہ، معقول اور پرکشش محسوس ہوتی ہے۔ مگر فلسفے میں اصل سوال سادگی کا نہیں، **درست قیاس (Valid Analogy)** کا ہوتا ہے۔

استدلال کا مسئلہ: False Analogy

یہاں مفتی شمائل ندوی کی فکری گرفت سامنے آتی ہے۔ چائے دانی کی مثال اور **خدا** کے تصور کے درمیان ایک بنیادی فرق موجود ہے:

- **چائے دانی ایک من مانی، غیر ضروری اور تجربی دنیا کی شے ہے۔**

- خدا کا تصور وجود، کائنات، علت، معنی، اخلاق اور شعور سے جڑا ہوا سوال ہے۔

چائے دانی:

- نہ کائنات کی وضاحت کرتی ہے
- نہ وجود کی
- نہ اخلاق کی
- نہ مقصدِ حیات کی

جبکہ خدا:

- ان تمام سوالات کی جڑ میں موجود ہے

لہٰذا خدا کو چائے دانی جیسی مثال کے برابر رکھنا ایک False Analogy ہے، جو فلسفے میں ایک واضح منطقی مغالطہ شمار ہوتی ہے۔

مفتی شمائل ندوی کا بنیادی جوابی نکتہ: "انکار بھی ایک دعویٰ ہے"

یہاں مکالمہ ایک نئے درجے میں داخل ہوتا ہے۔ مفتی شمائل ندوی نہایت سکون سے یہ بنیادی سوال اٹھاتے ہیں:

"کیا یہ کہنا کہ "خدا موجود نہیں ہے" بذاتِ خود ایک دعویٰ نہیں؟"

یہ نکتہ بحث کی سمت بدل دیتا ہے، کیونکہ عموماً دہریے اپنے موقف کو محض شک یا **غیر جانبداری** کے طور پر پیش کرتے ہیں، جبکہ حقیقت میں دہریت ایک **قطعی انکار** ہے۔

تین فکری مؤقف۔ ایک لازمی تفریق

اس مقام پر تین الگ الگ موقف واضح کرنا ضروری ہے:

1 تھیزم (Theism)

"خدا موجود ہے"

- یہ ایک مثبت دعویٰ ہے
- اس کے لیے فلسفیانہ، عقلی اور اخلاقی دلائل درکار ہوتے ہیں

2 دہریت (Atheism)

"خدا موجود نہیں ہے"

- یہ بھی ایک مثبت اور قطعی دعویٰ ہے
- اس کے لیے بھی ثبوت درکار ہے
- محض "مجھے نظر نہیں آتا" کہنا دلیل نہیں بنتا

3 لاادریت (Agnosticism)

"میں نہیں جانتا"

- یہ واحد موقف ہے جس پر واقعی بارِ ثبوت لاگو نہیں ہوتا
- یہ علمی دیانت کی ایک شکل ہے، انکار کی نہیں

مفتی شمائل ندوی واضح کرتے ہیں کہ:

- جاوید اختر کا طرزِ بیان لاادری نہیں،
- بلکہ دہریہ ہے،
- اور دہریت دلیل مانگنے کے ساتھ ساتھ خود دلیل دینے کی پابند ہوتی ہے۔

فلسفیانہ اصول: Burden of Proof

فلسفہ کہتا ہے: **بارِ ثبوت (Bar-e-Suboot) دعوے کے ساتھ جڑا ہوتا ہے، چاہے وہ وجود کا ہو یا عدمِ وجود کا۔**

لہٰذا:

- "خدا ہے" → دلیل چاہیے
- "خدا نہیں ہے" → دلیل چاہیے
- "میں نہیں جانتا" → علمی طور پر محفوظ موقف

یہاں مفتی شمائل ندوی جاوید اختر کے بیانیے میں موجود بنیادی تضاد کو بے نقاب کرتے ہیں:

- وہ ثبوت مانگتے ہیں،
- مگر اپنے انکار کے لیے خود کوئی مثبت دلیل پیش نہیں کرتے۔

نتیجہ: مکالمے کا اصل سبق

یہ باب ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ:

- خدا کے وجود پر بحث جذباتی نعروں سے نہیں،
- بلکہ دعووں کی نوعیت سمجھنے سے آگے بڑھتی ہے۔

جاوید اختر کی دلیل:

- سننے میں مضبوط،
- مگر فلسفیانہ اعتبار سے نامکمل ہے۔

مفتی شمائل ندوی کا جواب:

- نہ جارحانہ ہے،
- نہ دفاعی،
- بلکہ علمی توازن پر قائم ہے۔

یہی اس Case Study کی روح ہے:

- مناظرے نہیں،
- مکالمے؛
- فتوے نہیں،
- فہم؛
- اور شور نہیں،
- دلیل۔

جاوید اختر اور مفتی شمائل ندوی کا تعارف

جاوید اختر:

برصغیر کے معروف ادیب، شاعر، مکالمہ نگار اور سیکولر فکر کے حامل دانشور ہیں۔ وہ اپنے جذباتی، ذہین اور دلکش انداز کے لیے معروف ہیں۔ انہوں نے خاص طور پر مسئلہ شر کو بنیاد بنایا اور دنیا میں ظلم، جنگ اور معصوم بچوں کی ہلاکتوں کو خدا کی صفات کے ساتھ جوڑ کر سوال کیا۔ گفتگو میں انہوں نے الحاد کا موقف اختیار کیا اور خدا کے وجود پر سوالات اٹھائے اور ان کا اصل موقف یہ تھا کہ "میں وہی مانتا ہوں جو عقل مانتی ہے"۔ ان کا مکالماتی انداز اکثر طنز، استہزاء اور Red Herrings پر مبنی ہوتا ہے، جس سے سامعین کو مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ موضوع سے غور و فکر کے بجائے جذباتی طور پر متوجہ ہوں۔

مفتی شمائل ندوی:

عصرِ حاضر کے معروف اسلامی مفکر، اسکالر اور داعی ہیں۔ وہ جدید اسلامی فلسفہ، سائنس، مذہب اور Faith کے باہمی تعلق پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ ان کی گفتگو میں استدلال، تحمل اور علمی وقار نمایاں ہوتا ہے۔ ان کا مقصد خدا کے وجود کو عقلی، فلسفیانہ اور اخلاقی دلائل کے ذریعے سمجھانا ہے۔ ان کا انداز سکون، شائستگی اور Socratic Method پر مبنی ہے، یعنی وہ سوال اٹھاتے ہیں اور سامعین کو سوچنے پر مجبور کرتے ہیں، بغیر کسی پر دباؤ ڈالے۔ مکالمے کے دوران وہ ہمیشہ دلائل کے ساتھ نرم لہجہ استعمال کرتے ہیں، تاکہ مخالف کے موقف کا احترام بھی برقرار رہے۔

اہم فرق

پہلو	جاوید اختر	مفتی شمائل ندوی
موقف	عقل اور Empirical Evidence پر انحصار	Faith + Reason +فلسفہ+اخلاق
مکالماتی انداز	طنز، استہزاء، Red Herrings	سکون، شائستگی، Socratic Method
اثر	Charisma اور جذباتی کشش	دلیل، منطق اور Faith کے ساتھ علمی اثر

نتیجہ:

- جاوید اختر اور مفتی شمائل ندوی دونوں اپنے اپنے دائرے میں اثر انداز ہیں۔
- ایک طرف جذباتی اور ذہنی کشش، دوسری طرف عقلی، فلسفیانہ اور اخلاقی روشنی۔
- یہ اختلافات Case Study کے مکالماتی تجزیے کے لیے بنیاد فراہم کرتے ہیں۔

بابِ اوّل

خدا کے وجود پر بحث: تاریخی، مذہبی اور فکری پس منظر

تعارف اور پس منظر

1.1 سولِ خدا: انسانی شعور کی قدیم ترین جستجو / دنیا میں خدا کے وجود پر بحث کی تاریخ

انسانی تاریخ کا شاید سب سے قدیم، سب سے گہرا اور سب سے مستقل سوال یہ رہا ہے کہ: "**کیا خدا موجود ہے؟**" یہ سوال کسی خاص مذہب، تہذیب یا دور کا پیدا کردہ نہیں، بلکہ انسانی شعور کے ساتھ ہی وجود میں آیا۔ جیسے ہی انسان نے اپنے اردگرد کے مظاہر پر غور کرنا شروع کیا۔ انسان کی تاریخ کا مطالعہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ انسانی ذہن ہمیشہ سے کائنات کے راز اور اپنی موجودگی کے سبب کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا ہے۔ انسان نے اپنے ماحول میں موجود حیرت انگیز مظاہر جیسے آسمان کی وسعت، زمین کی زرخیزی، سورج اور چاند کی باقاعدہ گردش، زندگی اور موت کا پراسرار تسلسل۔ ویسے ہی اس کے ذہن میں یہ احساس پیدا ہوا کہ یہ سب محض اتفاق نہیں ہو سکتا۔ "**یہ سب کیوں اور کس کے لیے ہیں؟**" اسی جستجو نے ابتدائی انسان نے قدرت کے مظاہر کو مختلف خداؤں، دیوتاؤں یا اعلیٰ ہستیوں کا تصور کرنے پر مجبور کیا۔ بارش، آندھی، زلزلہ، پیداوار اور قحط۔ ہر شے کے پیچھے کسی نہ کسی مافوق الفطرت قوت کا تصور موجود تھا۔ اگرچہ یہ تصورات سادہ اور اساطیری (Mythical / Mythological) تھے، مگر ان کے پیچھے ایک گہری فکری جبلّت کارفرما تھی: "**ہر اثر کے پیچھے کسی سبب کی تلاش۔**" یہی جبلّت آگے چل کر فلسفے، مذہب اور سائنس کی بنیاد بنی۔

ابتدائی خداؤں کا تصور:

ابتدائی انسان نے اپنی زندگی اور ماحول کی بنیاد پر مختلف خداؤں کا تصور کیا۔

- زمین، آسمان، پانی، سورج، چاند اور دیگر قدرتی مظاہر کو خداؤں سے جوڑا گیا۔
- مذہبی رسومات اور عقائد اس بات کی نشاندہی کرتے تھے کہ انسان ہمیشہ کسی اعلیٰ طاقت کے وجود کو محسوس کرتا رہا ہے، چاہے اسے علم یا فلسفہ کا فہم نہ ہو۔
- مثال کے طور پر، قدیم مصری، میسوپوٹیمیا اور یونان کے لوگ مختلف خداؤں کی پوجا کرتے تھے، جو انسانی زندگی اور کائنات کے مختلف پہلوؤں کے لیے ذمہ دار تصور کیے جاتے تھے۔

1.2 یونانی فلسفہ اور عقل و منطق

یونانی فلسفیوں نے خدا کے وجود پر بحث کو قدیم روایات سے نکال کر **عقل** اور **منطق** کے دائرے میں داخل کیا۔ افلاطون نے "**عالمِ مُثل**" (World of Forms) کا تصور پیش کیا، جہاں ہر مادی شے کی ایک کامل، غیر مادی حقیقت موجود ہے۔ اس کے نزدیک مادی دنیا ناقص ہے اور اس کے پیچھے ایک اعلیٰ، عقلی حقیقت کارفرما ہے۔

ارسطو نے اس بحث کو مزید منظم کیا اور "**اولین محرک**" (Prime Mover) یا "**پہلی علت**" (First Cause) کا نظریہ پیش کیا۔ اس کے مطابق کائنات میں حرکت ہے، اور ہر حرکت کسی محرک کی محتاج ہے۔ اگر ہم ہر محرک کو کسی اور محرک کا محتاج مانتے جائیں تو یہ سلسلہ یا تو لامتناہی ہو گا یا پھر کسی ایسی ہستی پر ختم ہو گا جو خود غیر متحرک ہو مگر سب کو حرکت دینے والی ہو۔ یہی تصور بعد میں **Necessary Being** کے فلسفیانہ تصور کی بنیاد بنا۔

اہم بات یہ ہے کہ یونانی فلسفہ **خدا** کو **وحی** کے ذریعے نہیں، بلکہ **عقل** کے ذریعے **سمجھنے** کی کوشش کرتا ہے۔ یہاں **خدا** ایمان کا نہیں، **استدلال (Reasoning / Argumentation) کا مسئلہ** بنتا ہے۔

یونانی فلسفہ نے **خدا** کے **وجود** کی بحث کو ایک نئی سمت دی، جہاں مذہبی عقائد کے بجائے **عقل**، **منطق** اور **دلیل** کو بنیاد بنایا گیا۔

- **افلاطون** (Plato) نے خدا کو "Highest Form of Good" کے طور پر بیان کیا، جس سے دنیا کی تمام حقیقتیں اور معیارات پیدا ہوتے ہیں۔
- **ارسطو** (Aristotle) نے پہلی علت (Unmoved Mover) کا تصور پیش کیا، جس کے بغیر کائنات کی موجودگی ممکن نہیں۔ ارسطو کے مطابق یہ پہلی علت خود موجود ہے اور کسی اور پر منحصر نہیں۔
- یونانی فلسفہ نے پہلی بار سوالات کو محض روحانی یا مذہبی نہیں رکھا بلکہ **عقلی** اور **منطقی** سطح پر بھی لے آیا۔

1.3 مشرقی فلسفہ اور ماورائی حقیقت / روحانیت

مشرقی فلسفوں میں خدا یا حتمی حقیقت کا تصور محض منطقی نہیں بلکہ **روحانی اور وجودی** (Existential) بھی ہے۔ ہندو فلسفے میں برہمن کو مطلق حقیقت مانا گیا۔ ایک ایسی غیر متغیر ہستی جو کائنات کے پس پردہ ہے۔ بودھ فلسفہ اگرچہ ذاتی خدا کے تصور سے احتراز کرتا ہے، مگر پھر بھی وہ مادی حقیقت کو آخری نہیں مانتا اور

نروان (خواہش، دکھ، انا اور جنم و مرگ کے چکر سے مکمل نجات) جیسے ماورائی تصور کو پیش کرتا ہے۔ اسلامی فلسفہ ان دونوں جہتوں کو یکجا کرتا ہے:

- عقل
- وحی
- اور اخلاق

فارابی، ابن سینا اور ابن رشد جیسے مفکرین نے خدا کے وجود پر **عقلی، فلسفیانہ اور منطقی دلائل** پیش کیے، جن میں Contingency Argument اور Necessary Being کا تصور مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔

اسلامی روایت میں خدا صرف فلسفیانہ مفروضہ نہیں، بلکہ ایک زندہ، فعال اور اخلاقی حقیقت ہے، جو انسان کی زندگی کے ہر پہلو کو معنی دیتی ہے۔

مشرقی فلسفہ نے خدا یا الٰہی حقیقت کے تصور کو روحانیت اور metaphysics کے تناظر میں پیش کیا:

- **ہندو فلسفہ** میں برہما، وشنو، اور شیو کے تصور کے ذریعے کائنات کی تخلیق، حفاظت اور تباہی کو سمجھایا گیا۔
- **بودھ مت** میں براہِ راست خدا کی موجودگی پر سوال نہیں، مگر کائناتی قوانین اور وجود کی حقیقت پر غور کیا گیا۔
- **اسلامی فلسفہ** میں ابنِ سینا، الغزالی اور فارابی جیسے فلسفیوں نے دلیل، عقلی استدلال، اور فلسفہ کی بنیاد پر خدا کے وجود کو ثابت کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے metaphysical حقیقت، وجود، واجب الوجود اور ممکن الوجود کے مفاہیم کو واضح کیا۔

1.4 مذہبی، فلسفیانہ اور علمی تناظر کا فرق

خدا کے وجود پر بحث کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم تین مختلف تناظرات میں فرق کریں:

مذہبی تناظر

مذہب میں خدا کا وجود بنیادی طور پر ایمان (Faith) کی بنیاد پر قبول کیا جاتا ہے۔ یہاں سوال "کیا خدا موجود ہے؟" سے زیادہ "میں خدا سے کیا تعلق رکھتا ہوں؟" ہوتا ہے۔ مذہبی ایمان تجربہ، وحی اور اخلاقی احساس پر قائم ہوتا ہے۔

فلسفیانہ تناظر

فلسفہ خدا کے وجود کو دلائل کے ذریعے پرکھتا ہے۔Contingency Argument، علت و معلول کا سلسلہ، Infinite Regress اور Necessary Being جیسے تصورات اسی دائرے میں آتے ہیں۔ یہاں خدا ماننے یا نہ ماننے کا سوال نہیں، بلکہ **دلائل کی معقولیت** زیرِ بحث ہوتی ہے۔

علمی (سائنسی) تناظر

سائنس Empirical Evidence پر کام کرتی ہے۔یعنی وہ چیزیں جو مشاہدہ، تجربہ اور پیمائش کے دائرے میں آئیں۔ چونکہ خدا time، space اور matter سے ماورا مانا جاتا ہے، اس لیے سائنس نہ اس کے وجود کو ثابت کر سکتی ہے، نہ رد۔

یہاں ایک بنیادی مغالطہ جنم لیتا ہے: **"جو چیز سائنسی تجربے میں نہ آئے، اسے غیر موجود مان لینا۔"** حالانکہ یہ منطق خود سائنسی نہیں بلکہ فلسفیانہ ہے۔

1.5 جدید دور اور میڈیا کا کردار

آج کے دور میں خدا کے وجود پر بحث نہ صرف فلسفے اور مذہب میں ہے بلکہ سائنس، میڈیا، سوشل نیٹ ورکس اور ٹی وی مکالموں اور معاشرتی تناظر نے اسے عوامی سطح پر لا کھڑا کیا ہے۔ جاوید اختر اور مفتی شمائل ندوی کے درمیان ہونے والا مکالمہ اسی رجحان کی ایک نمایاں مثال ہے۔

- **سائنس**: بگ بینگ، کائنات کی توسیع، اور توانائی کی اصل جیسے موضوعات انسان کو نئے سوالات دیتے ہیں: *کائنات کیسے وجود میں آئی؟ توانائی کہاں سے آئی؟*
- **میڈیا**: ٹی وی پروگرام، ڈاکیومینٹریز، اور debates میں خدا کے وجود پر مکالمہ عام ہے، جس میں لوگ فلسفے، سائنس، اور مذہب کے نکات لے کر سوالات اٹھاتے ہیں۔

معاصر فلسفہ: عقلی، منطقی، اور metaphysical دلائل کے ذریعے کائنات میں معقولیت، مقصد، اور خدا کے وجود پر غور کیا جاتا ہے۔

لاکھوں لوگ ایسے مباحث دیکھتے ہیں، سنتے ہیں اور ان سے متاثر ہوتے ہیں۔ مگر مسئلہ صرف یہ نہیں کہ کون سا موقف درست ہے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ:

- دلیل کیسے پیش کی جارہی ہے
- اسلوب کیا ہے
- اور مخاطب کے ذہن پر نفسیاتی اثر کیا پڑتا ہے

یہی وہ مقام ہے جہاں فلسفہ، نفسیات اور مکالمے کا علم ایک دوسرے سے جڑ جاتے ہیں۔

1.6 تاریخ کا سبق: خداؤں کا قبرستان

جاوید اختر کا تاریخی تجزیہ۔ایک تنقیدی مطالعہ

یہ کہنا درست ہے کہ خدا کا تصور انسانی تاریخ میں نیا نہیں۔ انسان جب سے خود کو کائنات میں تنہا اور بے بس محسوس کرنے لگا، اس نے طاقت، نظم اور معنی کو کسی بالاتر ہستی سے منسوب کرنا شروع کر دیا۔ یوں تاریخ ایسے خداؤں سے بھر گئی جنہیں ایک زمانے میں سچ مانا گیا، مگر آج وہ صرف اساطیر، داستانوں اور میوزیم کی دیواروں تک محدود ہیں۔

جاوید اختر اسی تاریخی حقیقت کو بنیاد بنا کر ایک بنیادی سوال اٹھاتے ہیں۔ وہ یاد دلاتے ہیں کہ یونان کا زیوس، روم کا جوپیٹر، مصر کا را، اور جرمن تہذیب کے مختلف دیوتا، یہ سب اپنے وقت میں عبادت کے مرکز تھے۔ان پر یقین رکھنے والے معاشرے جاہل یا غیر عقلی نہیں تھے، بلکہ وہ اپنے زمانے کے لحاظ سے علمی، فکری اور تہذیبی اعتبار سے ترقی یافتہ تھے۔

جاوید اختر کے نزدیک اصل مسئلہ یہ ہے: اگر ماضی میں مانے گئے خداؤں کو وقت نے رد کر دیا، اگر تاریخ نے ایک کے بعد دوسرے خدا کو دفن کر دیا، تو کیا یہ ممکن نہیں کہ موجودہ خدا بھی ایک دن اسی "**خداؤں کے قبرستان**" کا حصہ بن جائے؟

یہ استدلال بظاہر سادہ ہے، مگر اس میں ایک گہرا فکری چیلنج پوشیدہ ہے۔یہ دلیل خدا کے تصور کو **ماورائی حقیقت** کے بجائے **تاریخی مظہر** (Historical Phenomenon) کے طور پر دیکھنے کی دعوت دیتی ہے۔

اس استدلال کی فکری قوت

جاوید اختر کی بات میں ایک قوت ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ وہ ہمیں یہ احساس دلاتے ہیں کہ صرف یہ کہنا کافی نہیں کہ "ہم مانتے ہیں"۔ یہ بھی دیکھنا ہو گا کہ ماضی میں ماننے والے بھی یقین رکھتے تھے، مگر ان کا یقین تاریخ کی کسوٹی پر پورا نہ اتر سکا۔ یہ نکتہ ہمیں **اندھی تقلید** سے بچاتا ہے اور سوال اٹھانے کا حوصلہ دیتا ہے جو کسی بھی علمی مکالمے کی بنیاد ہے۔

لیکن سوال یہ ہے: کیا یہ استدلال منطقی طور پر حتمی ہے؟

جاوید اختر کا استدلال ایک **تاریخی مشاہدے** پر مبنی ہے، مگر وہ اس مشاہدے سے ایک **کلی نتیجہ** اخذ کرتے ہیں۔ منطق کی زبان میں اسے Historical Generalization کہا جاتا ہے۔

یعنی:

چونکہ ماضی کے خدا رد ہوئے، اس لیے ہر خدا رد ہونے کے قابل ہے۔

یہاں ایک خاموش مفروضہ شامل ہے: کہ تمام خداؤں کا تصور **ایک ہی نوعیت** کا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں فلسفیانہ تفریق ناگزیر ہو جاتی ہے۔

Contingent خداؤں اور Necessary Being کا فرق

تاریخ کے بیشتر خداؤں میں چند مشترک خصوصیات تھیں:

- وہ محدود تھے
- کسی خاص جگہ یا قوم سے وابستہ تھے
- انسانی جذبات رکھتے تھے
- ایک دوسرے سے ٹکراتے اور لڑتے تھے
- وقت اور حالات کے ساتھ بدلتے تھے

یہ تمام خصوصیات فلسفے میں Contingent Existence کی نشانیاں ہیں۔

یعنی ایسا وجود:

- جو ہو بھی سکتا ہے اور نہ بھی ہو سکتا ہے

- جو کسی اور پر منحصر ہو
- جو حالات کے بدلنے سے ختم ہو جائے

ایسے خداؤں کا تاریخ سے مٹ جانا خدا کے تصور کے باطل ہونے کی دلیل نہیں، بلکہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ خدا نہیں تھے، بلکہ **طاقتور مخلوق کے اساطیری تصورات** تھے۔

اسلامی تصورِ خدا اور تاریخی خداؤں میں بنیادی فرق

یہی وہ نکتہ ہے جہاں مفتی شمائل ندوی کا موقف سامنے آتا ہے۔

اسلامی تصورِ خدا:

- واجب الوجود ہے
- غیر محدود ہے
- زمان و مکان سے ماورا ہے
- کسی قوم یا علاقے سے خاص نہیں
- کسی دوسرے وجود کا محتاج نہیں

یہ تصور تاریخ کے کسی خدا سے مشابہ نہیں۔ اسے تاریخ میں "آنا" اور "جانا" نصیب ہی نہیں ہو سکتا، کیونکہ یہ تصور کسی تہذیبی ارتقا کا نتیجہ نہیں بلکہ ایک **فلسفیانہ Necessity** کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔

تاریخی استدلال کی حد

جاوید اختر کا استدلال یہاں آ کر اپنی حد کو پہنچتا ہے۔ تاریخ ہمیں یہ بتا سکتی ہے کہ لوگ کیا مانتے رہے ہیں، لیکن یہ نہیں بتا سکتی کہ **کیا لازمی طور پر موجود ہونا چاہیے**۔

یہ فرق سمجھے بغیر:

- ہر خدا کو ایک خانے میں ڈال دینا
- ہر ایمان کو ایک ہی سطح پر پرکھنا

فلسفیانہ طور پر درست نہیں۔

نتیجہ: سوال باقی رہتا ہے، مگر مفہوم بدل جاتا ہے

جاوید اختر کا سوال اپنی جگہ اہم ہے، مگر اس کا درست جواب یہ نہیں کہ "ہر خدا ختم ہو جائے گا"۔

بلکہ درست سوال یہ بنتا ہے:

کیا ہم جس خدا کی بات کر رہے ہیں وہ بھی ان تاریخی خداؤں کی طرح Contingent ہے، یا وہ Necessary Being کے تصور پر پورا اترتا ہے؟

مفتی شمائل ندوی کا جوابی استدلال

1. اختلاف کی بنیاد: سوال کی درست تشکیل

مفتی شمائل ندوی اپنے جواب کا آغاز ایک بنیادی اصلاح سے کرتے ہیں:

"جب سوال ہی غلط ہو تو جواب کتنا ہی شاندار کیوں نہ ہو، نتیجہ غلط ہی نکلتا ہے۔"

جاوید اختر کا سوال یہ تھا: **"کیا خدا ہے؟"**

جبکہ مفتی صاحب کے نزدیک اصل سوال یہ ہے: **"کس نوعیت کے خدا کی بات ہو رہی ہے؟"**

یہی وہ مقام ہے جہاں فکری مباحث بکھر جاتے ہیں۔ ہر خدا ایک جیسا نہیں ہوتا، اور ہر تصورِ خدا کو ایک ہی پیمانے سے ناپنا علمی انصاف نہیں۔

2. تاریخی خداؤں اور واجب الوجود میں فرق

مفتی شمائل ندوی واضح کرتے ہیں کہ تاریخ میں جن خداؤں کا ذکر ملتا ہے وہ سب **محدود، مشروط اور محتاج** تھے:

- کسی قوم سے وابستہ
- کسی علاقے تک محدود
- کسی قدرتی مظہر کی نمائندگی

ایسے خدا:

- پیدا ہو سکتے ہیں
- بدل سکتے ہیں
- ختم ہو سکتے ہیں

جبکہ اسلامی تصورِ خدا:

- کسی قوم یا زمانے کا محتاج نہیں
- کسی مظہر کی نمائندگی نہیں
- **بلکہ وجود کی اصل شرط ہے**

لہٰذا یہ کہنا کہ "پچھلے خدا مٹ گئے، اس لیے یہ خدا بھی مٹ جائے گا" منطقی طور پر ایک **غلط قیاس** ہے۔

3. تجربیت (Empiricism) کی حدبندی

مفتی شمائل ندوی تجربیت کے دعوے پر سوال اٹھاتے ہیں: "اگر صرف وہی مانا جائے جو تجربے میں آئے تو عقل، اخلاق اور ریاضی کا وجود بھی خطرے میں پڑ جاتا ہے۔"

کیا:

- عقل کو تولا جا سکتا ہے؟
- اخلاق کو ناپا جا سکتا ہے؟
- ریاضی کے قوانین کو تجربے میں رکھا جا سکتا ہے؟

نہیں۔

لیکن اس کے باوجود یہ سب **حقیقت** ہیں۔

نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ: Empiricism علم کا ذریعہ تو ہے لیکن **علم کی واحد اتھارٹی نہیں**۔

4. علّتوں کا لامتناہی سلسلہ (Infinite Regress)

یہ مفتی شمائل ندوی کا سب سے مضبوط منطقی نکتہ ہے۔

وہ کہتے ہیں:

اگر ہر چیز کسی اور کی محتاج ہے اور وہ بھی کسی اور کی تو یہ سلسلہ اگر کبھی نہ رکے تو **کچھ بھی وجود میں نہیں آ سکتا**۔ لیکن کائنات موجود ہے۔

یعنی:

- کہیں نہ کہیں یہ سلسلہ رکا

- اور وہ مقام ایسا ہے جو خود محتاج نہیں

اسی کو فلسفہ:

ecessary Being اور مذہب: **خدا** کہتا ہے۔ یہ خدا کسی خلا کو پُر کرنے کے لیے نہیں بلکہ **عقل کی مجبوری** کے طور پر سامنے آتا ہے۔

5. عقل: حاکم یا رہنما؟

مفتی صاحب عقل کی توہین نہیں کرتے، بلکہ اس کی **حدود واضح** کرتے ہیں۔

"عقل عظیم ہے، مگر سب کچھ جاننے کا دعویٰ نہیں کرتی۔"

جب عقل:

- خود اپنی حد مان لیتی ہے تو وہ **وحی** سے ٹکراتی نہیں بلکہ اس کی طرف **رہنمائی** کرتی ہے۔

یہاں عقل اور وحی دشمن نہیں بلکہ **دو مختلف دائرے** ہیں جو ایک ہی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

مفتی شمائل ندوی کا استدلال کسی جذباتی ردِ عمل پر مبنی نہیں بلکہ منطقی ترتیب، فلسفیانہ وضاحت اور سوال کی درست تشکیل پر قائم ہے۔ جاوید اختر سوال اٹھاتے ہیں اور یہ سوال اہم ہیں۔ مگر مفتی شمائل ندوی یہ دکھاتے ہیں کہ ہر سوال، انکار کا نتیجہ نہیں ہوتا۔ کبھی کبھی سوال خود جواب کی طرف پہلا قدم ہوتا ہے۔

1.6 بابِ اوّل کا خلاصہ

اس باب میں ہم نے دیکھا کہ:

- **خدا** کے وجود پر بحث انسانی تاریخ جتنی پرانی ہے۔
- دنیا میں **خدا** کے وجود پر بحث ہمیشہ سے موجود رہی، چاہے وہ **مذہبی** ہو یا **فلسفیانہ**۔
- تاریخ میں بہت سے خدا مانے گئے، پھر رد ہو گئے، اس لیے خدا کا تصور انسانی تخلیق ہے۔
- ہر دور کے انسان نے اپنی فہم، تجربات، اور علوم کی روشنی میں خدا کی حقیقت کو جاننے اور سمجھنے کی کوشش کی۔
- یہ بحث صرف مذہبی نہیں بلکہ فلسفیانہ اور علمی بھی ہے۔

- ابتدائی انسان قدرتی مظاہر، یونانی فلسفی عقل و منطق، مشرقی فلسفہ، اور جدید سائنس و میڈیا، یہ تمام راستے خدا کے وجود پر غور کرنے کے مختلف زاویے ہیں۔
- مختلف تہذیبوں نے اس سوال کو مختلف زاویوں سے سمجھا۔
- جدید دور میں میڈیا نے اس بحث کو نئی شدت دی ہے۔
- اہم نکتہ یہ ہے کہ خدا کے وجود پر بحث صرف مذہبی نہیں بلکہ فلسفیانہ اور علمی بھی رہی ہے۔
- مفتی صاحب یہاں ایک بنیادی سوال اٹھاتے ہیں: "کیا علم صرف وہی ہے جو لیبارٹری میں ثابت ہو؟"
- جاوید اختر کے دلائل سوال پیدا کرتے ہیں مگر فیصلہ نہیں دیتے۔ مفتی شمائل ندوی کا جواب سوال کو درست مقام پر لے جاتا ہے۔ اور وجودِ خدا کو فلسفیانہ ناگزیریت کے طور پر پیش کرتا ہے۔
- مفتی صاحب دکھ کو خدا کی عدم موجودگی نہیں بلکہ **انسان کے اختیار** کی علامت مانتے ہیں۔

مسئلہ شر، انسانی اختیار اور امتحانِ کائنات

مسئلہ شر، اعتراض نہیں، دلیل (The Problem of Evil: From Objection to Evidence)

خدا کے وجود کے خلاف پیش کیے جانے والے دلائل میں **مسئلہ شر** (Problem of Evil) سب سے زیادہ طاقتور، جذباتی اور بظاہر فیصلہ کن سمجھا جاتا ہے۔ یہ سوال صدیوں سے دہرایا جا رہا ہے:

اگر خدا قادرِ مطلق ہے، اور کامل عدل و رحم رکھتا ہے تو دنیا میں اتنی برائی، ظلم اور ناانصافی کیوں ہے؟

یہی وہ سوال ہے جسے جاوید اختر اپنے فکری اسلوب میں یوں پیش کرتے ہیں کہ سننے والا فوری طور پر متاثر ہو جاتا ہے۔

جاوید اختر کا اعتراض: شر خدا کے وجود کی نفی کرتا ہے

جاوید اختر کے مطابق:

- اگر خدا موجود ہوتا
- اگر وہ قادر اور عادل ہوتا

تو:

  - بچوں پر ظلم نہ ہوتا
  - بے گناہوں کا قتل نہ ہوتا
  - قدرتی آفات معصوم جانیں نہ لیتیں

ان کے نزدیک: ”ایسی دنیا میں خدا کا تصور اخلاقی طور پر ناقابلِ قبول ہے۔“

یہ دلیل صرف منطقی نہیں بلکہ **جذباتی اخلاقی طاقت** رکھتی ہے اور یہی اس کی اصل قوت ہے۔

Problem of Evil یا مسئلہ خیر و شر الحاد کی سب سے پرانی اور سب سے زیادہ استعمال ہونے والی دلیل ہے۔

اس کا کلاسیکی فارم کچھ یوں ہے:

1. اگر خدا موجود ہے تو وہ:
   - قادرِ مطلق (All-Powerful) ہو گا
   - خیرِ محض (All-Good) ہو گا

2. اگر خدا قادر اور خیر ہے

→تو دنیا میں شر (دکھ، ظلم، بیماری، ناانصافی) نہیں ہونی چاہیے

3. لیکن دنیا میں شر موجود ہے

نتیجہ (ملحدانہ):

یا تو خدا موجود نہیں

یا وہ قادر نہیں

یا وہ خیر نہیں

یہ دلیل بظاہر **جذباتی طور پر بہت مضبوط** لگتی ہے، اسی لیے جاوید اختر جیسے لوگ اسے آخر میں استعمال کرتے ہیں۔

جاوید اختر کی دلیل: جذبات کی اپیل

جاوید اختر کا سوال تھا: "اگر خدا ہے تو اتنی تکلیف کیوں ہے؟"

یہ سوال:

- منطقی کم
- جذباتی زیادہ ہے

کیونکہ یہ:

- بھوک
- بیماری
- بچوں کی تکلیف

کو بنیاد بنا کر سامنے والے کے **اخلاقی احساس** کو جھنجھوڑتا ہے۔ یہ Argument : " Appeal to Emotion " کہلاتا ہے۔

یعنی:

- دل کو چھوتا ہے
- مگر دلیل مکمل نہیں ہوتی

مفتی شمائل ندوی کا بنیادی نکتہ:

شر کا اعتراض خدا کو رد نہیں کرتا، بلکہ فرض کرتا ہے

مفتی شمائل ندوی نے ایک نہایت اہم بات کہی: "اگر مصائب خدا کے نہ ہونے کا ثبوت ہیں تو پھر انصاف کا مطالبہ بے معنی ہو جاتا ہے" یہ جملہ عام نہیں تھا۔ یہ فلسفۂ اخلاق پر سیدھا وار تھا۔

مفتی شمائل ندوی یہاں گفتگو کا رخ بدل دیتے ہیں۔

وہ کہتے ہیں:

"آپ جب کسی چیز کو شر کہتے ہیں تو آپ پہلے ہی ایک معیارِ خیر کو مان چکے ہوتے ہیں۔" یہ جملہ اس پوری بحث کی کنجی ہے۔

یہاں ایک بنیادی سوال پیدا ہوتا ہے: جب جاوید اختر کہتے ہیں: "یہ دنیا ظالمانہ ہے"

تو سوال یہ ہے:

- ظلم کس معیار سے؟
- ناانصافی کس قانون کے تحت؟
- خیر اور شر کا پیمانہ کہاں سے آیا؟

اگر:

- کوئی خدا نہیں
- کوئی ماورائی اخلاق نہیں

تو پھر:

- سب کچھ Survival of the Fittest ہے
- طاقتور کا حق کمزور کو کچلنا ہے

تو پھر:

"یہ غلط ہے" کہنے کا حق کہاں سے آیا؟

خیر و شر کا معیار کہاں سے آیا؟

یہاں سوال اٹھتا ہے:

- شر کس کے مقابلے میں شر ہے؟
- ظلم کس معیار پر ظلم ہے؟
- ناانصافی کو ناپنے کی کسوٹی کیا ہے؟

اگر:

- یہ معیار فطرت سے آیا ہے
  تو فطرت خود غیر اخلاقی ہے
- اگر یہ معیار انسان نے بنایا ہے
  تو ہر ظلم کو طاقت "درست" بنا سکتی ہے

مگر حقیقت یہ ہے:

- انسان ظلم کو طاقت کے باوجود غلط کہتا ہے
- قاتل کو ظالم کہتا ہے،
  چاہے وہ قانون سے بچ جائے

یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ: انسان کسی **اعلیٰ اخلاقی معیار** کو مانتا ہے

جو:

- فطرت سے بلند
- انسان سے بالا
- اور طاقت سے آزاد ہے

شر کی موجودگی اور احتساب کا تقاضا

مفتی صاحب مزید کہتے ہیں:

- اگر ظلم واقعی "بس فطرت" ہے

تو:

  - انصاف کی بات بے معنی ہو جاتی ہے
  - مظلوم کی فریاد محض شور رہ جاتی ہے

مگر انسان:

- فطرت پر بھی اعتراض کرتا ہے
- تقدیر پر بھی سوال اٹھاتا ہے

یہ سوال:

احتساب (Accountability) کا تصور پیدا کرتا ہے۔

اور احتساب:

- بغیر علم
- بغیر اختیار
- بغیر عدل

کے ممکن نہیں۔

آخرت: جذباتی سہارا یا عقلی ضرورت؟

یہاں ایک فیصلہ کن موڑ آتا ہے۔ مفتی شمائل ندوی کے مطابق:

- دنیا میں حتمی انصاف نظر نہیں آتا
- بہت سے ظالم سزا کے بغیر مر جاتے ہیں
- بہت سے مظلوم انصاف دیکھے بغیر دنیا چھوڑ جاتے ہیں

اگر:

- یہی آخری عدالت ہے

تو:

- انصاف ایک دھوکہ ہے
- اخلاقیات ایک فریب

لہٰذا:

- یا تو انصاف واقعی بے معنی ہے
- یا پھر ایک **حتمی عدالت** لازمی ہے

یہ عدالت:

- وقت سے ماورا
- طاقت سے آزاد
- اور علمِ کامل پر مبنی ہونی چاہیے

یہی وہ مقام ہے جہاں:

خدا + آخرت

ایک عقلی اخلاقی ضرورت بن جاتے ہیں۔

نتیجہ: مسئلۂ شر کس کے حق میں؟

اس باب کا نتیجہ واضح ہے:

- شر کا وجود خدا کے خلاف دلیل نہیں
- بلکہ:
  - اخلاقی معیار
  - انصاف کی طلب
  - احتساب کا تصور

سب مل کر

ایک عادل، قادر اور باخبر خدا کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

یعنی:

اگر شر واقعی ہمیں تکلیف دیتا ہے تو یہ تکلیف خود اس بات کا ثبوت ہے کہ انسان کسی اعلیٰ عدل کو پہچانتا ہے۔

Free Will : اختیار کے بغیر اخلاق ممکن نہیں

مفتی شمائل ندوی دکھ اور تکلیف کو خدا کے خلاف دلیل نہیں بلکہ انسان کی غلط توقع قرار دیتے ہیں۔

وہ کہتے ہیں: اگر دنیا کو جنت ہونا چاہیے تھا تو امتحان کا تصور بے معنی ہو جاتا۔

انسان کو:

- اختیار دیا گیا
- انتخاب دیا گیا

اور اختیار کے بغیر:

- نہ اخلاق ممکن ہے
- نہ ذمہ داری
- نہ معنی

اس لیے دکھ: خدا کی غیر موجودگی کا ثبوت نہیں بلکہ ایک بامقصد نظام کا لازمی جز ہے۔

مفتی شمایل کا دوسرا نکتہ: ”شر، انسان کے بااختیار ہونے کی دلیل ہے“

اگر:

- انسان مجبور ہو
- اس کے پاس اختیار نہ ہو

تو:

- نہ نیکی معنی رکھتی ہے
- نہ بدی

مثال: اگر ایک روبوٹ کسی کو قتل کرے

تو ہم:

- روبوٹ کو مجرم نہیں کہتے

کیونکہ اس کے پاس اختیار نہیں

انسان:

- اختیار رکھتا ہے
- اس لیے ذمہ دار ہے

اور اختیار:

- شر کا امکان بھی لاتا ہے

یہی Free Will Defense ہے۔جو فلسفے میں صدیوں سے تسلیم شدہ ہے۔

دنیا: Comfort Zone یا Testing Zone ؟

یہاں مفتی شمائل نے نہایت خوبصورت تمثیل دی: "اگر دنیا میں دکھ نہ ہوتا تو یہ امتحان گاہ نہ ہوتی جنت ہوتی"

یہ ایک بنیادی نکتہ ہے:

- مذہب دنیا کو Final Destination نہیں مانتا
- بلکہ Testing Ground مانتا ہے

امتحان:

- آسان نہیں ہوتا
- سوالات مشکل ہوتے ہیں
- ناکامی کا امکان ہوتا ہے

اگر:

- ہر چیز کامل ہوتی
- کوئی دکھ نہ ہوتا

تو:

- اخلاق

- صبر
- قربانی
- ہمدردی

سب بے معنی ہو جاتے

فلمی مثال اور جاوید اختر کا میدان

مفتی شمائل نے جان بوجھ کر جاوید اختر کے میدان میں بات کی: "اگر کہانی میں ولن نہ ہو اور ہیرو کو مشکل نہ ہو تو کہانی بے مقصد ہو جاتی ہے"

یہ مثال:

- جاوید اختر کے لیے
- انتہائی Meaningful تھی

کیونکہ:

- وہ خود کہانیوں کا خالق ہے

یہاں:

- ملحد فلسفہ
- اسکرپٹ رائٹنگ کی منطق سے ہار گیا

قدرتی شر (Natural Evil) کا جواب

اکثر کہا جاتا ہے: "زلزلے، بیماریاں، حادثات انسان نے نہیں کیے"

جواب:

1. دنیا قوانینِ فطرت پر چلتی ہے
2. قوانین کے بغیر سائنس ممکن نہیں
3. قوانین ہوں گے تو ان کے نتائج بھی ہوں گے

اگر:

- آگ جلانے کی طاقت رکھتی ہے

تو:

- وہ جلائے گی

یہ:

- خدا کی عدم موجودگی نہیں
- بلکہ قانونی کائنات کی نشانی ہے

انصاف کا تصور: انسانی ایجاد یا خدائی پیمانہ؟

(Moral Argument for the Existence of God)

جاوید اختر کا موقف: انصاف ایک انسانی تصور ہے، فطری حقیقت نہیں

جاوید اختر کے مطابق:

"فطرت میں کوئی انصاف موجود نہیں۔ شیر ہرن کو کھا جاتا ہے، یہ نہ اچھا ہے نہ برا یہ صرف فطرت ہے۔"

ان کے نزدیک:

- فطرت میں نہ رحم ہے
- نہ انصاف
- نہ اخلاق

یہ سب:

- انسانی معاشروں کی تخلیق ہیں
- سماجی نظم و ضبط کے لیے گھڑے گئے تصورات ہیں

اسی بنیاد پر وہ یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ:

"موت کے بعد انصاف کا تصور انسان کی اپنی خواہش اور خوف کی پیداوار ہے، کسی خدائی حقیقت کا تقاضا نہیں۔"

یہ موقف بظاہر سادہ اور تجربے سے ہم آہنگ معلوم ہوتا ہے، مگر یہی سادگی اس کا سب سے بڑا سوال بھی ہے۔

مفتی شمائل ندوی کا جواب:

شر کا وجود خدا کے خلاف نہیں، بلکہ اس کی دلیل ہے۔

مفتی شمائل ندوی اس دلیل کو بالکل مختلف زاویے سے دیکھتے ہیں۔

وہ کہتے ہیں: "اگر دنیا میں واقعی کوئی انصاف نہیں، تو ناانصافی کا شکوہ بھی بے معنی ہو جاتا ہے۔"

یہاں وہ ایک بنیادی سوال اٹھاتے ہیں:

- اگر ظلم واقعی "**صرف فطرت**" ہے
- تو انسان اسے ظلم کیوں کہتا ہے؟
- اسے غلط کیوں سمجھتا ہے؟
- اس کے خلاف آواز کیوں اٹھاتا ہے؟

یہی آواز **احتساب** (Accountability) کا تصور پیدا کرتی ہے۔

شر، احتساب اور اعلیٰ منصف کا تصور

مفتی صاحب کے مطابق:

- برائی کا شعور
- انصاف کی طلب
- مظلوم کی فریاد

یہ سب اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ: انسان کسی **اعلیٰ اخلاقی معیار** کو مانتا ہے

جو:

- طاقت سے بالاتر ہے
- فطرت سے بلند ہے
- اور انسان کی خواہش سے آزاد ہے

یہ معیار اگر:

- انسانی ایجاد ہوتا تو ہر معاشرہ اپنے ظلم کو "**درست**" کہہ سکتا تھا

مگر حقیقت یہ ہے کہ:

- ظلم ہر جگہ ظلم ہی سمجھا جاتا ہے
- چاہے کرنے والا کتنا ہی طاقتور کیوں نہ ہو

یہ عالمگیر اخلاقی احساس ایک **اعلیٰ ترین منصف** کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

آخرت کا تصور: خواہش یا عقلی ضرورت؟

جاوید اختر

- آخرت کو انسانی خواہش قرار دیتے ہیں

جبکہ مفتی شمائل ندوی

- اسے **عقلی ناگزیریت** کہتے ہیں۔

وہ دلیل دیتے ہیں:

- دنیا میں بے شمار مظلوم انصاف کے بغیر مر جاتے ہیں
- بے شمار ظالم سزا سے بچ نکلتے ہیں

اگر یہی آخری عدالت ہے تو انصاف ایک **نامکمل واب** بن کر رہ جاتا ہے۔

لہٰذا:

- یا تو انصاف ایک فریب ہے
- یا پھر ایک ایسی عدالت لازمی ہے

  جہاں:

  - ہر عمل کا حساب ہو
  - ہر ظلم کا جواب ہو

یہی تصور:

خدا + آخرت کو محض عقیدہ نہیں بلکہ **عقلی اخلاقی تقاضا** بنا دیتا ہے۔

فلسفیانہ نتیجہ

یہ بحث اس نتیجے پر پہنچتی ہے کہ:

- اگر انصاف محض انسانی ایجاد ہے تو اس کی کوئی حتمی حیثیت نہیں
- اگر انصاف واقعی معنی رکھتا ہے تو اس کے پیچھے ایک **ماورائی، عادل اور باخبر ہستی** لازم ہے

یعنی:

شر کا وجود خدا کے خلاف دلیل نہیں **بلکہ انصاف کے خدا کی ضرورت کا اعلان ہے۔**

باب دوم

بنیادی فلسفیانہ اصول

خدا کے وجود پر ہونے والی ہر سنجیدہ بحث، چاہے وہ مذہبی ہو، فلسفیانہ ہو یا تنقیدی، چند بنیادی تصورات پر کھڑی ہوتی ہے۔ اگر ان تصورات کو واضح طور پر نہ سمجھا جائے تو پوری گفتگو محض الفاظ کا تبادلہ بن کر رہ جاتی ہے۔

یہ باب انہی بنیادی فلسفیانہ ستونوں کو واضح کرنے کے لیے مختص ہے، جن پر **Contingency Argument**، **Necessary Being** اور **Infinite Regress** جیسے دلائل قائم ہوتے ہیں۔

یہ وہ مفاہیم ہیں جنہیں سمجھے بغیر نہ جاوید اختر کا اعتراض مکمل طور پر سمجھ میں آ سکتا ہے اور نہ مفتی شمائل ندوی کا جواب۔

2.1 Metaphysical Reality کیا ہے؟

مادی حقیقت اور ماورائی حقیقت کا فرق

ہم روزمرہ زندگی میں جن چیزوں سے واسطہ رکھتے ہیں وہ سب Physical Reality کا حصہ ہیں:

میز، کرسی، درخت، انسان، سیارے، کہکشائیں یہ سب time، space اور matter کے اندر موجود ہیں۔

اس کے برعکس **Metaphysical Reality** وہ حقیقت ہے جو:

- حسی تجربے سے ماورا ہو
- پیمائش کے آلات سے گرفت میں نہ آتی ہو
- مگر عقل کے لیے ناگزیر ہو

مثال کے طور پر:

ریاضی کے قوانین، منطق کے اصول، اخلاقی اقدار، علت و معلول کا قانون، یہ سب نظر نہیں آتے مگر انکار بھی ممکن نہیں۔

اہم نکتہ:

جو چیز مادی نہ ہو، ضروری نہیں کہ وہ غیر حقیقی ہو۔

فلسفے میں **Metaphysical Reality** سے مراد وہ حقیقت ہے جو "مادی دنیا، حسی تجربے اور سائنسی آلات کی پہنچ سے باہر ہو، مگر عقل اور منطق کے ذریعے اس کے وجود کو سمجھا اور مانا جا سکے۔"

ہماری روزمرہ زندگی میں ہم زیادہ تر **Physical Reality** سے واسطہ رکھتے ہیں:

- جو دیکھی جا سکتی ہے
- چھوئی جا سکتی ہے
- ناپی، تولی اور تجربہ گاہ میں پرکھی جا سکتی ہے

لیکن فلسفہ یہ سوال اٹھاتا ہے کہ:

- کیا حقیقت صرف وہی ہے جو آنکھ دیکھ لے؟
- کیا وقت، شعور، محبت، اخلاق، ریاضیاتی قوانین، منطق کے اصول بھی مادی ہیں؟

مثال کے طور پر:

- عدد "2" کہاں موجود ہے؟
- منطق کا اصول "عدمِ تضاد" (A اور Not-A ایک ساتھ درست نہیں ہو سکتے) کہاں رکھا ہوا ہے؟

یہ سب چیزیں:

- مادی نہیں
- مگر حقیقی ہیں

یہی **Metaphysical Reality** ہے۔ خدا کا تصور بھی اسی دائرے میں آتا ہے، کیونکہ:

- وہ time، space اور matter سے ماورا ہے
- اس لیے اسے سائنسی تجربے یا حسی آلات سے ناپنا فلسفیانہ طور پر غلط فریم ہے۔

2.2 مذہبی، فلسفیانہ اور علمی تناظر

انسان خدا کے وجود کو سمجھنے کے لیے تین اہم تناظر اختیار کرتا ہے: مذہبی، فلسفیانہ، اور علمی۔ ہر تناظر اپنے زاویے سے حقیقت کو دیکھتا ہے اور سوالات کا جواب دینے کی کوشش کرتا ہے۔

مذہبی تناظر (Religious Perspective)

مذہبی نقطہ نظر کے مطابق خدا کی موجودگی ایمان کی بنیاد پر تسلیم کی جاتی ہے۔

- یہ ایمان کسی سائنسی یا فلسفیانہ دلیل کے محتاج نہیں ہوتا، بلکہ دل، روح، اور مذہبی تجربات پر مبنی ہوتا ہے۔
- ایمان کے حامل انسان خدا کی حقیقت کو دل کی گہرائیوں سے محسوس کرتا ہے، چاہے وہ اسے حواس خمسہ سے نہ دیکھ سکے۔
- مذہبی تناظر میں خدا کی موجودگی کو زندگی کے اصول، عبادات، اخلاقیات اور انسانی رویوں کے ذریعے بھی محسوس کیا جاتا ہے۔

مثال:

- ایک مسلمان اپنے دن کا آغاز اذان سے کرتا ہے اور نماز کے دوران خدا کی موجودگی کو دل میں محسوس کرتا ہے۔
- مذہبی متن، دعائیں اور روحانی تجربات اس ایمان کو تقویت دیتے ہیں۔

فلسفیانہ تناظر (Philosophical Perspective)

فلسفہ خدا کے وجود کو دلیل اور منطق کی بنیاد پر سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔

- Contingency Argument : کائنات میں موجود ہر چیز کسی نہ کسی وجہ سے موجود ہے، اور یہ سلسلہ کسی مقام پر (Necessary Being خدا) پر ختم ہوتا ہے۔
- سلسلہ علت (Chain of Cause) : ہر موجود چیز کا سبب کوئی اور چیز ہے، لیکن سلسلہ لامتناہی نہیں ہو سکتا۔
- Necessary Being : وہ ہستی جو قائم بالذات ہے، کسی اور پر منحصر نہیں، اور جس کا وجود لازمی ہے۔

مثال:

- سیب ایک contingent چیز ہے، وہ درخت کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ درخت کے لیے مٹی اور پانی ضروری ہیں۔ مٹی، سورج، اور دیگر عناصر کے بغیر وجود ممکن نہیں۔

- یہ سلسلہ جہاں رکتا ہے، وہ ہستی خدا ہے، جو خود پر قائم ہے۔

علم اور لاعلمی: سائنس کی عاجزی بمقابلہ مذہب کا ایقان

جاوید اختر: سوال کرنے سے ہی ترقی ہوتی ہے

- سائنس اپنی کم علمی کو تسیم کرتی ہے اور فخر سے کہتی ہے "ہم نہیں جانتے" یہ اس کی طاقت ہے۔
- مذہب ہر چیز کو جاننے کا دعویٰ کرتا ہے، جس سے مزید سوالات کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔
- مذہبی کتابوں میں ڈائنوسار کا ذکر کیوں نہیں، لیکن کائنات کی تخلیق کی تفصیلات موجود ہیں؟

مفتی شمائل ندوی: سائنس پرستی میں فرق

- مذہب سوال کرنے کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔
- ہم "سائنس" کو مانتے ہیں، لیکن "سائنس پرستی" (Scientism) کو مسترد کرتے ہیں، جو یہ مانتی ہے کہ علم کو واحد ذریعہ سائنس ہے۔
- مذہبی کتابوں کا موضوع اخلاقیات اور غیر مادی حقائق ہیں نہ کہ سائنسی تفصیلات۔

علم اور لاعلمی : سائنس کی عاجزی بمقابلہ مذہب کا ایقان

خدا کے وجود پر ہونے والے جدید مکالموں میں ایک نمایاں فکری کشمکش **علم اور لاعلمی** کے تصور کے گرد گھومتی ہے۔ یہ کشمکش دراصل سائنس اور مذہب کے درمیان نہیں، بلکہ **علم کے ذرائع (Sources of Knowledge)** کے درمیان ہے۔

جاوید اختر ایک ایسا مؤقف پیش کرتے ہیں جو بظاہر نہایت روشن خیال، ترقی پسند اور سائنسی محسوس ہوتا ہے، مگر گہرے تجزیے پر کئی بنیادی سوالات کو جنم دیتا ہے۔

جاوید اختر کا موقف: سوال ہی ترقی کی بنیاد ہے

جاوید اختر کے مطابق انسانی ترقی کا اصل محرک سوال ہے۔ وہ کہتے ہیں: "**سائنس اپنی کم علمی کو تسلیم کرتی ہے** اور فخر سے کہتی ہے: "**ہم نہیں جانتے**"۔ یہی اس کی اصل طاقت ہے۔"

ان کے نزدیک:

- سائنس کسی حتمی علم کا دعویٰ نہیں کرتی،
- بلکہ ہر نتیجے کو عارضی (Provisional) سمجھتی ہے،
- اور نئے شواہد کی بنیاد پر خود کو درست کرنے کے لیے تیار رہتی ہے۔

اس کے برعکس، جاوید اختر مذہب پر یہ تنقید کرتے ہیں کہ:

- مذہب ہر بنیادی سوال کا پہلے سے جواب دے دیتا ہے،
- **"یہ خدا کی مرضی ہے"** کہہ کر سوال بند کر دیتا ہے،
- اور یوں انسانی تجسس اور فکری ارتقا کی راہ میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔

اسی تناظر میں وہ ایک مشہور اعتراض دہراتے ہیں: "اگر مذہب سچ ہے تو مقدس کتابوں میں **ڈائنوسار** کا ذکر کیوں نہیں؟ لیکن کائنات کی تخلیق کی تفصیلات ضرور موجود ہیں۔"

یہ اعتراض پہلی نظر میں سادہ مگر ذہین محسوس ہوتا ہے، کیونکہ یہ مذہب کو **سائنسی معیار** پر پرکھنے کی کوشش کرتا ہے۔

اس موقف کا پوشیدہ مفروضہ

جاوید اختر کے استدلال کے پیچھے ایک خاموش مفروضہ کارفرما ہے:

"حقیقی علم وہی ہے جو سائنسی طریقے سے حاصل ہو۔"

یہی مفروضہ دراصل مفتی شمائل ندوی کے جواب کا نقطۂ آغاز بنتا ہے۔

مفتی شمائل ندوی کا جوابی مؤقف: سائنس کو ماننا، سائنس پرستی کو نہیں

مفتی شمائل ندوی نہایت وضاحت سے ایک بنیادی فرق واضح کرتے ہیں: "ہم سائنس کے مخالف نہیں، ہم سائنس پرستی (Scientism) کے مخالف ہیں۔"

سائنس(Science)

- علم حاصل کرنے کا ایک معتبر طریقہ
- تجربہ، مشاہدہ اور تکرار پر مبنی
- مادّی دنیا (Physical Reality) تک محدود

سائنس پرستی (Scientism)

- یہ دعویٰ کہ علم کا واحد ذریعہ سائنس ہے
- جو چیز سائنسی تجربے میں نہ آئے، وہ حقیقت نہیں

مفتی صاحب کے مطابق یہی وہ نکتہ ہے جہاں مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ سائنس خود اپنی حدود تسلیم کرتی ہے، مگر سائنس پرستی ان حدود کو ماننے سے انکار کر دیتی ہے۔

مذہب اور سوال: ایک غلط فہمی

جاوید اختر کا یہ کہنا کہ مذہب سوالات بند کر دیتا ہے،
مفتی شمائل ندوی کے نزدیک ایک تاریخی اور فکری مغالطہ ہے۔

اسلامی روایت میں:

- "افلا تعقلون"
- "افلا تتفکرون"
- "افلا ینظرون"

جیسے سوالی اسالیب بار بار آتے ہیں۔

مفتی صاحب واضح کرتے ہیں:

- مذہب سوال کرنے سے نہیں روکتا،
- بلکہ سوال کو اخلاقی اور فکری دائرے میں رکھتا ہے۔

فرق یہ ہے کہ:

- سائنس "کیسے" (How) کا جواب دیتی ہے،
- مذہب "کیوں" (Why) کا۔

ڈائنوسار کا اعتراض: موضوع کا مغالطہ (Category Mistake)

ڈائنوسار کا ذکر نہ ہونے کا اعتراض دراصل ایک Category Mistake ہے۔

مفتی شمائل ندوی کی دلیل سادہ مگر گہری ہے:

- ریاضی کی کتاب میں اخلاقیات نہیں ہوتیں،
- فزکس کی کتاب میں شاعری نہیں ہوتی،
- اور مذہبی کتاب کا مقصد سائنسی انسائیکلوپیڈیا ہونا نہیں۔

مقدس کتابوں کا موضوع:

- اخلاق
- مقصدِ حیات
- خیر و شر
- خدا، انسان اور کائنات کا تعلق

نہ کہ:

- حیاتیاتی انواع کی فہرست
- یا ارضیاتی ادوار کی تفصیل

یہاں مسئلہ مذہب کا نہیں، بلکہ **غلط توقع (Misplaced Expectation)** کا ہے۔

علم اور لاعلمی: دو مختلف اعتراف

یہ باب ہمیں ایک نہایت اہم فرق سمجھاتا ہے:

- سائنس کہتی ہے:

"ہم نہیں جانتے۔۔۔فی الحال"

- مذہب کہتا ہے:

"ہر چیز جاننا ضروری نہیں، ہر چیز کا معنی جاننا ضروری ہے"

سائنس کی لاعلمی تحقیقی عاجزی ہے، جبکہ مذہب کا ایقان وجودی رہنمائی۔ یہ دونوں متصادم نہیں، جب تک ایک دوسرے کی حدود کو تسلیم کیا جائے۔

نتیجہ: مکالمے کا توازن

جاوید اختر کا زور:

- سوال پر ہے

مفتی شمائل ندوی کا زور:

- سوال کے دائرے پر

یہ Case Study ہمیں یہ سکھاتی ہے کہ:

- سوال کرنا ترقی ہے،
- مگر ہر سوال کو ہر معیار پر پرکھنا فکری زیادتی ہے۔

جہاں سائنس خاموش ہوتی ہے، وہیں مذہب بولتا ہے ۔ اور جہاں مذہب خاموش ہوتا ہے، وہیں سائنس کو بولنے کا حق حاصل ہے۔ یہی توازن اس مکالمے کی اصل کامیابی ہے۔

علمی تناظر (Scientific Perspective)

مفتی شمائل ندوی کا موقف: محدودیت سائنس:

سائنس خدا کو ثابت نہیں کر سکتی کیوں کہ یہ صرف مادی اور طبعی دنیا سے بحث کرتی ہے۔ جبکہ خدا ایک غیر مادی حقیقت ہے۔ جدید سائنس خدا کے وجود کو Empirical Evidence کے ذریعے پرکھنے کی کوشش کرتی ہے، مگر خدا metaphysical حقیقت ہے، جو وقت، جگہ اور مادّہ (time, space, matter) سے **ماورا** ہے۔

- سائنس کے آلات اور تجربات صرف مادی دنیا میں محدود ہیں۔
- خدا کے وجود کی جانچ مادی observations یا laboratory experiments کے ذریعے ممکن نہیں۔

مثال:

- اگر کوئی سائنسدان چاہے کہ خدا کا وجود لیبارٹری میں پرکھے، وہ ناکام رہے گا کیونکہ خدا کا وجود physical objects یا measurable phenomena سے متعلق نہیں۔

- انسانی حواس بھی خدا کی حقیقت کو perceive کرنے کے لیے ناکافی ہیں، کیونکہ یہ metaphysical reality ہے۔

خلاصہ

- مذہبی تناظر Faith اور روحانی تجربے پر انحصار کرتا ہے۔
- فلسفیانہ تناظر عقل، منطق اور دلائل کے ذریعے خدا کے وجود کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔
- علمی تناظر میں خدا کا وجود direct empirical evidence سے پرکھنا ممکن نہیں، کیونکہ وہ time, space, matter سے ماورا ہے۔

نتیجہ: یہ تینوں زاویے مل کر انسان کو خدا کے وجود اور اس کی حقیقت کے مختلف پہلو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں، ہر تناظر اپنے دائرے میں معتبر ہے۔

2.2 Contingent Existence کیا ہے؟

ممکن الوجود کی وضاحت

سادہ الفاظ میں:

فلسفے میں Contingent Existence / Contingent Being اس چیز کو کہتے ہیں:

- جو ہو بھی سکتا تھا
- اور نہ بھی ہو سکتا تھا
- اور جس کے ہونے کے لیے کسی اور چیز کی ضرورت ہو

یعنی اس کا وجود **لازمی نہیں** بلکہ مشروط ہے۔

سادہ مثال: سیب کی زنجیر

فرض کریں آپ کے ہاتھ میں ایک سیب ہے:

- سیب ← درخت سے آیا۔ درخت ← مٹی، پانی، سورج سے۔ مٹی ← زمین کے نظام سے زمین ← سورج کے گرد گردش سے۔ سورج ← کہکشانی نظام سے۔۔۔۔۔

یہ پوری زنجیر ہمیں بتاتی ہے کہ: کوئی بھی شے **خود بخود موجود نہیں** ہر شے کسی اور پر انحصار **(Chain of Dependence)** کرتی ہے۔ یہی انحصار **Contingency** کہلاتا ہے۔

- ہر شے کسی اور کی محتاج
- خود اپنے وجود کی ضامن نہیں

پوری کائنات میں ہم جو کچھ دیکھتے ہیں:

- کہکشائیں
- ستارے
- ایٹم
- توانائی

سب اسی زمرے میں آتے ہیں۔

2.3 Contingency Argument (دلیلِ امکان) کی بنیاد

سوال کی اصل نوعیت

Contingency Argument یہ نہیں پوچھتا کہ: "یہ چیز کیسے بنی؟"

بلکہ یہ پوچھتا ہے: **"یہ موجود کیوں ہے؟"**

یہ فرق نہ سمجھنے کی وجہ سے اکثر بحث غلط رخ پر چلی جاتی ہے۔

دلیل کا بنیادی ڈھانچہ

1. کائنات میں موجود ہر شے Contingent ہے
2. Contingent اشیاء خود اپنے وجود کی وضاحت نہیں کر سکتیں
3. اگر سب کچھ contingent ہو تو وجود کی حتمی وضاحت ممکن نہیں
4. لہٰذا ایک ایسی ہستی کا ہونا لازم ہے جو:
    - خود Contingent نہ ہو
    - بلکہ Necessary ہو

اسی کو Necessary Being کہا جاتا ہے۔

سلسلۂ علت (Chain of Causes)

اگر کائنات کی ہر چیز کنٹنجنٹ (Contingent) ہے، تو آخر اس پورے سلسلے کی بنیاد کیا ہے؟

ہم دیکھتے ہیں:

- ہر چیز کی کوئی نہ کوئی وجہ ہے
- ہر واقعہ کسی سابقہ واقعے پر منحصر ہے

اگر ہم یہ مان لیں کہ:

- ہر علت کے پیچھے ایک اور علت ہے
- اور یہ سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوتا

تو ایک بنیادی مسئلہ پیدا ہوتا ہے:

اگر بنیاد ہی نہ ہو، تو عمارت کھڑی کیسے ہوئی؟

یہی وجہ ہے کہ فلسفہ کہتا ہے:

- کنٹنجنٹ (Contingent) چیزیں آخر کار کسی ایسی حقیقت پر ختم ہونی چاہئیں
- جو خود کسی پر منحصر نہ ہو

2.4 Necessary Being (واجب الوجود) کیا ہے؟

واجب الوجود کی تعریف

اس سلسلے کا آغاز ایک ہستی سے ہونا چاہیے جو خود کس کا نتیجہ نہ ہو۔ یہ "واجب الوجود" Necessary Being ہے جو اپنے وجود کے لیے کسی کا محتاج نہیں۔

Necessary Being وہ ہستی ہے:

- جس کا نہ ہونا ممکن نہیں / جس کا وجود خود اس کی ذات کا تقاضا ہو
- جو کسی اور پر منحصر نہیں / جو کسی اور کی محتاج نہ ہو
- جو existence کی بنیاد ہے، نتیجہ نہیں / جو نہ ہونے کا تصور ہی نہ رکھتی ہو

یہ کسی فلسفی کی ایجاد نہیں بلکہ **عقل کا تقاضا** ہے۔

اگر ایسی ہستی نہ مانی جائے تو:

- وجود محض اتفاق بن جاتا ہے
- اور اتفاق کبھی حتمی وضاحت نہیں دے سکتا

یہ ہستی:

- **Contingent** نہیں
- بلکہ وجود کی بنیاد ہے

یہی وہ مقام ہے جہاں فلسفہ **خدا** کے تصور تک پہنچتا ہے، نہ کہ مذہبی جذبات سے بلکہ خالص **عقلی** مجبوری کے تحت۔

2.5 Infinite Regress (لامتناہی سلسلہ) اور اس کا مسئلہ

لامتناہی سلسلہ کیوں مسئلہ ہے؟

کچھ لوگ کہتے ہیں: **"ہر چیز کسی اور چیز سے آئی، یہ سلسلہ لامحدود ہے، کسی آغاز کی ضرورت نہیں"**۔ یہ بظاہر معقول لگتا ہے، مگر منطقی طور پر ناقابلِ دفاع ہے۔

مثال: امیگریشن کاؤنٹر کی

فرض کریں:

- ایک امیگریشن کاؤنٹر ہے
- ہر شخص کہتا ہے: **"میں آگے والے کی اجازت سے آیا ہوں"**
- مگر کوئی پہلا شخص موجود ہی نہیں

سوال:

پھر یہ قطار شروع کیسے ہوئی؟

لامتناہی اجازتیں بھی تب تک **بے معنی** ہیں جب تک کوئی **اصل اجازت دینے والا** نہ ہو۔

لامتناہی علّتیں بھی اس وقت تک بے معنی رہتی ہیں جب تک کسی ایک اصل اور خود قائم علّت کو تسلیم نہ کیا جائے۔ ایسا علّی سلسلہ جس کی کوئی ابتدا نہ ہو، فلسفے میں اسی لیے ایک مسئلہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ کسی بھی واقعے کے حقیقی وقوع کی وضاحت نہیں کر سکتا۔

اسے دوسری مثال سے سمجھتے ہیں۔

فرض کریں:

- ایک ایئرپورٹ پر آپ سے کہا جائے: "آپ اندر تب جا سکتے ہیں جب آپ سے پہلے والا کلیئر ہو جائے"

مگر:

- ہر شخص کہتا ہے:

مجھ سے پہلے کوئی اور ہے

اگر یہ سلسلہ لامتناہی ہو:

- تو کوئی بھی کبھی اندر نہیں جا سکے گا

یعنی:

اگر ابتدا نہ ہو تو موجودہ حالت ممکن نہیں۔

2.6 کائنات اور Infinite Regress (لامتناہی سلسلہ)

اگر کائنات میں:

- ہر وجود کسی اور پر منحصر ہو
- اور یہ سلسلہ کبھی ختم نہ ہو

تو:

- حقیقت میں کچھ بھی موجود نہ ہونا چاہیے

لیکن چونکہ ہم موجود ہیں،

لہٰذا:

Infinite Regress ایک نامکمل وضاحت ہے، مکمل جواب نہیں

کائنات میں پیدائش کا سلسلہ

- آپ کے والدین ← ان کے والدین ← ان کے والدین
- اگر یہ سلسلہ کبھی شروع ہی نہ ہوا ہو
- تو آپ کا موجود ہونا ممکن ہی نہیں

لہٰذا:

- **Infinite Regress** عقلی طور پر ناقابلِ قبول ہے
- کسی نہ کسی مقام پر ایک **غیر محتاج حقیقت** ضروری ہے

2.7 فلسفیانہ خلاصہ

اس باب سے یہ بنیادی نکات واضح ہوتے ہیں:

- Metaphysical Reality حقیقت ہے، تصور نہیں

  حقیقت صرف مادی نہیں، Metaphysical بھی ہوتی ہے

- کائنات کی ہر چیز Contingent ہے
- Contingent چیزیں خود اپنے وجود کی وضاحت نہیں کر سکتیں
- Contingent existence خود وضاحت فراہم نہیں کر سکتی
- Contingency Argument عقل کا فطری تقاضا ہے
- Infinite Regress منطقی طور پر ناکافی ہے

  Infinite Regress عقلی مسئلہ پیدا کرتا ہے

عقل اس بات پر مجبور ہوتی ہے کہ:

- ایک Necessary Being موجود ہو

  یہی Necessary Being فلسفے میں خدا کے تصور سے ہم آہنگ ہے

- Necessary Being کوئی مذہبی نعرہ نہیں بلکہ فلسفیانہ ضرورت ہے۔

اہم نکتہ:

یہ دلیل:

- خدا کو "لیبارٹری میں ثابت" نہیں کرتی
- مگر عقل کو یہ بتاتی ہے کہ: "بغیر خدا کے کائنات کی وضاحت نامکمل رہتی ہے۔"

باب سوم

جاوید اختر کا موقف: عقل، تجربہ اور جدید الحاد

کسی بھی فکری مکالمے میں سب سے بڑی ناانصافی یہ ہوتی ہے کہ مخالف کے موقف کو کمزور یا سطحی بنا کر پیش کیا جائے۔ یہ باب اسی ناانصافی سے بچنے کی شعوری کوشش ہے۔

جاوید اختر کا موقف نہ کوئی عام گلی محلے کا الحاد ہے اور نہ ہی محض ضد یا اشتعال۔ یہ موقف **جدید انسان کی ذہنی ساخت** کی نمائندگی کرتا ہے۔ وہ انسان جو سائنس سے متاثر ہے، مذہب سے بد ظن ہے،

اور روایت سے سوال کرتا ہے۔اس لیے اس موقف کو سمجھے بغیر نہ اس کا جواب ممکن ہے اور نہ اس Case Study کا مقصد پورا ہوتا ہے۔

3.1 "میں وہی مانتا ہوں جو عقل مانتی ہے" ۔ ایک بنیادی دعویٰ

جاوید اختر بار بار ایک جملہ دہراتے ہیں: **"میں وہی مانتا ہوں جو میری عقل مانتی ہے"**۔ بظاہر یہ جملہ بہت معقول، روشن خیال اور ترقی پسند معلوم ہوتا ہے۔ مگر فلسفے میں کسی **دعوے کی خوبصورتی** نہیں، **اس کی بنیاد** دیکھی جاتی ہے۔

سوال:

یہاں "**عقل**" سے کیا مراد ہے؟

- کیا **عقل** = سائنسی تجربہ؟
- کیا **عقل** = حسی مشاہدہ؟
- کیا **عقل** = ذاتی سمجھ؟

یہ ابہام پورے موقف کی بنیاد کو غیر واضح بنا دیتا ہے۔

"میں وہی مانتا ہوں جو عقل مانتی ہے"۔ دعویٰ اور اس کی جانچ:

جاوید اختر:

آج تک مجھے کسی مذہبی کتاب میں ڈائینوسارس کا ذکر نہیں ملا۔ تو معلوم ہوا کہ مذہب ٹھیک نہیں

مفتی شمائل صاحب:

آج تک مجھے maths کی کتاب میں ڈائینوسارس کا ذکر نہیں ملا۔ تو کیا maths ٹھیک نہیں؟

جاوید اختر کا بنیادی دعویٰ یہ ہے کہ وہ صرف اسی چیز کو قبول کرتے ہیں جسے عقل تسلیم کرے۔ اسی تناظر میں وہ کہتے ہیں کہ چونکہ مذہبی متون میں ڈائینوسارس کا ذکر موجود نہیں، اس لیے مذہب حقیقت کی مکمل تصویر پیش نہیں کرتا۔

یہ استدلال بظاہر معقول محسوس ہوتا ہے، مگر درحقیقت یہ علم کے دائرۂ کار (Scope) سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔

منطقی تشریح: اصل مسئلہ کیا ہے؟

یہاں جاوید اختر کا استدلال دراصل اس مفروضے پر کھڑا ہے کہ: "**ہر سچا علم ہر حقیقت کا ذکر کرے گا**"۔

یہ مفروضہ خود **غلط** ہے۔

ہر علم:

- ایک مخصوص **Domain** رکھتا ہے
- ایک خاص **Scope** میں کام کرتا ہے

مثال:

- **حیاتیات** ⟶ (Biology) جاندار
- **فلکیات** ⟶ (Astronomy) ستارے
- **ریاضی** ⟶ مقداری تعلقات
- **مذہب** ⟶ معنی، مقصد، اخلاق، ما بعد الطبیعی حقیقت

لہٰذا:

اگر مذہب میں ڈائینوسارس نہیں، تو یہ مذہب کی خامی نہیں، بلکہ **موضوع کی غیر متعلقگی** ہے۔

مفتی شمائل ندوی نے اس دعوے کا جواب نہایت سادگی اور وقار کے ساتھ دیا:

"مجھے آج تک کسی ریاضی (Maths) کی کتاب میں بھی ڈائینوسارس کا ذکر نہیں ملا۔ تو کیا اس بنیاد پر ہم یہ کہہ دیں کہ ریاضی ایک غلط یا ناکامل **علم** ہے؟"

مفتی صاحب نے کون سا مغالطہ پکڑا؟

یہاں مفتی شمائل ندوی نے ایک کلاسیکل **Logical Fallacy** کو بے نقاب کیا:

Category Error / Scope Fallacy

یعنی:

- ایک علم سے
- وہ جواب مانگنا
- جو اس کے دائرہ کار میں ہی نہیں

بالکل ویسے ہی جیسے:

- ریاضی سے حیاتیاتی تاریخ مانگنا
- یا اخلاقیات سے کیمیائی فارمولے

مفتی صاحب کا جواب جذباتی نہیں تھا، بلکہ ایک Epistemological Correction تھا: "علم کو اس کے دائرے میں رکھو۔"

یہ مثال اس بنیادی اصول کو واضح کرتی ہے کہ کسی علم میں کسی شے کا غیر موجود ہونا، اس علم کی نفی نہیں بنتا۔ بشرطیکہ وہ شے اس علم کے موضوع ہی سے متعلق نہ ہو۔ ہر علم ایک مخصوص میدان میں کام کرتا ہے، ریاضی مقدار اور نسبت کی بات کرتی ہے، حیاتیات جانداروں کی، اور مذہب انسان، کائنات اور مقصدِ وجود کے معنی بیان کرتا ہے۔

لہٰذا مذہب سے سائنسی انسائیکلوپیڈیا کی توقع رکھنا، اور پھر اس کمی کو مذہب کے خلاف دلیل بنانا، دراصل Category Error ہے۔ یعنی ایک علم سے وہ جواب مانگنا جو اس کے دائرے میں سرے سے آتا ہی نہیں۔ یہاں مسئلہ مذہب کا نہیں، بلکہ عقل کے غلط استعمال کا ہے؛ کیونکہ حقیقی عقل وہی ہے جو علم کو اس کی حدود میں رکھ کر پرکھے۔ یہ بات دراصل اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ عقل اور علم کی قدر اسی وقت باقی رہتی ہے جب ہم ان کی حدود کو بھی تسلیم کریں۔ عقل اگر ہر چیز کی پیمائش کا واحد آلہ بن جائے تو وہ خود غیر عقلی ہو جاتی ہے۔

مذہب کو اس بنیاد پر رد کرنا کہ وہ ہر سائنسی دریافت کا انسائیکلوپیڈیا نہیں، دراصل مذہب کو نہ سمجھنے کا اعتراف ہے، اس کی تردید نہیں۔

3.2 عقل اور تجربہ: ایک بنیادی مغالطہ

جاوید اختر کے ہاں عقل اور تجربہ اکثر ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو جاتے ہیں۔

وہ کہتے ہیں: "جو دکھائی نہ دے، جس کا تجربہ نہ ہو، وہ ماننے کے قابل نہیں"۔ یہ دراصل Empiricism کا موقف ہے، عقل پرستی نہیں۔

مسئلہ یہ ہے کہ:

- Empirical science صرف Physical Reality تک محدود ہے
- جبکہ خدا کا تصور **Metaphysical Reality** سے متعلق ہے

یہاں سائنس کا مطالبہ کرنا ایسا ہی ہے جیسے: "ریاضی کے اصول کو خوردبین کے نیچے رکھ کر دیکھنا۔"

3.3 "خدا نظر نہیں آتا" ۔ دلیل یا نفسیاتی تاثر؟

جاوید اختر کا ایک مرکزی اعتراض یہ ہے: "میں خدا کو نہیں دیکھتا، اس لیے نہیں مانتا"۔
یہ جملہ جذباتی طور پر طاقتور ضرور ہے، مگر منطقی طور پر کمزور۔ یہ فلسفے میں ایک معروف منطقی غلطی ہے۔ یہ دلیل دراصل اس مغالطے پر کھڑی ہے:

Absence of Evidence is Evidence of Absence
or
Absence of Evidence ≠ Evidence of Absence

مثال:

اگر ایک شخص کہے: "میں نے کبھی کششِ ثقل کو نہیں دیکھا، اس لیے وہ نہیں ہے"۔ تو ہم ہنس دیں گے، کیونکہ: کششِ ثقل دیکھی نہیں جاتی۔ مگر اس کے اثرات واضح ہیں۔ اسی طرح خدا کا معاملہ ہے۔ اثر کی سطح پر، نہ کہ شے کی سطح پر۔

- شعور نظر نہیں آتا
- ماضی نظر نہیں آتا

کیا یہ سب نہیں ہیں؟

مفتی شمائل ندوی نے درست نکتہ اٹھایا: "کسی شے کا علم میں نہ ہونا، اس کے وجود نہ ہونے کی دلیل نہیں۔"

یہاں مکالمہ:

- سائنس سے ہٹ کر
- علمیات **(Epistemology)** میں داخل ہو جاتا ہے۔

3.4 Epistemology پر حملہ یالاعلمی؟

جاوید اختر کا موقف دراصل خدا پر حملہ نہیں بلکہ **علمیات** **(Epistemology)** پر ایک غیر شعوری حملہ ہے۔ وہ یہ مفروضہ قائم کرتے ہیں کہ: "صرف وہی چیز قابلِ علم ہے جو تجربے میں آجائے"

مگر یہ مفروضہ خود:

- تجربے سے ثابت نہیں
- سائنسی طریقے سے قابلِ تصدیق نہیں

یعنی یہ خود اپنے ہی معیار پر پورا نہیں اترتا۔ یہ فلسفے میں **Self-Defeating Statement** کہلاتا ہے۔

3.5 Red Herrings اور موضوع سے انحراف

جاوید اختر کی گفتگو میں ایک نمایاں اسلوب یہ ہے کہ: جب اصل سوال مشکل ہو تو گفتگو کو جذباتی، سماجی یا تاریخی رخ دے دیا جائے

مثلاً:

- مذہبی انتہاپسندی، مذہب کے نام پر تشدد، ملاؤں کی غلطیاں

یہ سب حقیقی مسائل ہیں، مگر: "**یہ خدا کے وجود کے سوال کا جواب نہیں۔**" یہ Red Herring کہلاتا ہے۔یعنی بحث کو اصل نکتے سے ہٹا دینا۔

3.6 عقل کی حد کہاں ختم ہوتی ہے؟

جاوید اختر عقل کو ایک مطلق (Absolute) معیار بنا دیتے ہیں، مگر یہ نہیں بتاتے کہ:

- عقل کی حد کہاں ختم ہوتی ہے؟
- کیا عقل خود اپنا وجود ثابت کر سکتی ہے؟
- کیا عقل اخلاق کی بنیاد فراہم کر سکتی ہے؟

یہ وہ سوالات ہیں جہاں **خالص عقل خاموش ہو جاتی ہے۔** اور فلسفہ مجبور ہوتا ہے کہ کسی بنیادی حقیقت کو تسلیم کرے۔

3.7 موقف کا خلاصہ

اس باب میں ہم نے جاوید اختر کے موقف کو اس کے مضبوط ترین روپ میں دیکھا:

- عقل پر انحصار
- تجربے کی شرط
- ماورائی حقیقت سے انکار
- مذہبی روایت سے بد ظنی

مگر ساتھ ہی یہ بھی واضح ہوا کہ:

- یہ موقف کئی غیر ثابت شدہ مفروضوں پر کھڑا ہے
- عقل اور تجربے کو خلط ملط کرتا ہے
- Metaphysical Reality کو سائنسی پیمانے سے ناپنا چاہتا ہے

باب چہارم

مفتی شمائل ندوی کا جواب: توحید، عقل کی حدود اور سقراطی اسلوب

جواب نہیں، زاویۂ نظر کی تبدیلی

اس مکالمے میں مفتی شمائل ندوی کا امتیاز یہ نہیں کہ انہوں نے خدا کے وجود پر کوئی نیا فلسفیانہ ثبوت پیش کیا، بلکہ اصل کمال یہ ہے کہ انہوں نے **سوال کی سمت بدل دی**۔ جاوید اختر جہاں یہ پوچھ رہے

تھے: "خدا کہاں ہے؟ دکھائی کیوں نہیں دیتا؟"۔ وہیں مفتی شمائل ندوی نے اصل سوال اٹھایا: "آپ جاننے کے کن پیمانوں کو حتمی مانتے ہیں؟"۔ یہی وہ لمحہ ہے جہاں بحث مناظرے سے نکل کر **علمیات** (Epistemology) میں داخل ہوتی ہے۔

4.1 توحید بطور فکری مرکز، نہ کہ محض عقیدہ

مفتی شمائل ندوی کی گفتگو کی بنیاد کسی وقتی جذبات یا دفاعی ردِعمل پر نہیں، بلکہ **توحید** پر ہے۔ مگر توحید بطور نعرہ نہیں، بطور **فکری مرکز**۔ توحید یہاں یہ دعویٰ نہیں کہ: "بس مان لو، سوال مت کرو"۔ بلکہ یہ موقف ہے کہ: "**حقیقت ایک ہے، مگر اس تک پہنچنے کے راستے مختلف ہیں**"۔

یہی وجہ ہے کہ مفتی صاحب خدا کو:

- سائنسی تجربے کا موضوع نہیں بناتے
- مگر عقل کے دائرے سے باہر بھی نہیں نکالتے

وہ عقل کو اس کی **جائز حدود** میں رکھتے ہیں۔

4.2 مرعوبیت سے آزادی: نفسیاتی پہلو

یہ باب سمجھے بغیر مکمل نہیں ہوتا جب تک ہم ایک اہم نفسیاتی حقیقت کو نہ دیکھیں:

جاوید اختر:

- مشہور شخصیت
- ثقافتی اتھارٹی
- میڈیا کی طاقت
- سامعین کی تالیاں

عام طور پر مذہبی مقرر:

- یا تو دفاعی ہو جاتا ہے
- یا اشتعال میں آ جاتا ہے

مگر مفتی شمائل ندوی نے ان دونوں راستوں سے انکار کیا۔

کیوں؟

کیونکہ توحید کا ایک عملی اثر یہ بھی ہے کہ: ”عزت و ذلت، خوف و امید، سب ایک ہی مرکز سے جڑے ہوتے ہیں“

جب یہ یقین راسخ ہو جائے تو سامنے بیٹھا شخص:

- بڑا نہیں رہتا
- چھوٹا نہیں لگتا
- صرف ایک **انسان** رہ جاتا ہے

یہی نفسیاتی برتری ہے، جو شور کے بغیر قائم ہوتی ہے۔

4.3 Socratic Method: جواب کے بجائے سوال

مفتی شمائل ندوی کا سب سے طاقتور ہتھیار **سقراطی اسلوب** ہے۔ انہوں نے خدا کے وجود پر لمبی تقریر نہیں کی، بلکہ جاوید اختر سے ایک بنیادی سوال پوچھا: ”کیا کسی چیز کا آپ کے علم میں نہ ہونا، اس کے وجود نہ ہونے کی دلیل بن سکتا ہے؟“ یہ سوال سادہ ہے، مگر اس کے اثرات گہرے ہیں۔

یہ سوال:

- جاوید اختر کے پورے فریم ورک کو ہلا دیتا ہے
- بحث کو خدا سے ہٹا کر **علم کے معیار** پر لے آتا ہے

یہی وہ مقام ہے جہاں ملحد دفاعی پوزیشن میں آ جاتا ہے۔

4.4 ”Absence of Evidence“ کا مغالطہ

مفتی شمائل ندوی نے بغیر فلسفیانہ اصطلاحات کے ایک بڑا اصول واضح کیا: ”جو چیز نظر نہیں آتی، اس کا نہ ہونا ثابت نہیں ہو جاتا“۔ اندھے اور سورج کی مثال یہاں محض تمثیل نہیں، بلکہ ایک Epistemological آئینہ ہے۔

یہ مثال بتاتی ہے کہ:

- مسئلہ شے کا نہیں
- مسئلہ **ادراک کے آلے** کا ہے

اگر آلہ محدود ہو، تو نتیجہ بھی محدود ہو گا۔

4.5 عقل کی قدر، مگر عقل پرستی نہیں

مفتی صاحب نے بار بار واضح کیا: "**عقل قیمتی ہے، مگر مطلق نہیں**"

یہ جملہ جدید دنیا میں بہت اہم ہے، کیونکہ:

- **جدید انسان عقل کو خدا بنا بیٹھا ہے**
- **مگر عقل خود اپنی حدوں کا اعتراف کرتی ہے**

عقل:

- **محبت کو ناپ نہیں سکتی**
- **معنی پیدا نہیں کر سکتی**
- **اخلاق کو خود سے جنم نہیں دے سکتی**

یہ سب وہ مقامات ہیں جہاں:

عقل رُکتی ہے، Faith شروع ہوتا ہے۔ یہ Faith عقل کا دشمن نہیں، بلکہ اس کا **تکملہ** ہے۔

4.6 مسئلہ شر: جذبات نہیں، مقصد

جب جاوید اختر نے **دکھ** اور **مصیبت** کا سوال اٹھایا، تو مفتی شمائل ندوی نے اسے خدا کے خلاف دلیل نہیں مانا۔ انہوں نے سوال کو یوں پلٹ دیا: "**اگر دکھ غلط ہے، تو یہ "غلط" ہونے کا معیار کہاں سے آیا؟**"۔

یہ سوال اخلاقیات کی بنیاد پر حملہ ہے۔

اگر خدا نہیں:

- تو خیر و شر محض ذاتی احساس ہیں
- ظلم پر غصہ بے معنی ہو جاتا ہے

یوں مصیبت کا وجود:

- خدا کے نہ ہونے کی دلیل نہیں
- بلکہ اخلاقی شعور کے ہونے کی دلیل بن جاتا ہے

انصاف کا تصور: انسانی ایجاد یا خدائی پیمانہ؟

جاوید اختر: انصاف فطرت میں موجود نہیں۔

فطرت میں کوئی انصاف نہیں، شیر ہرن کو کھا جاتا ہے، اور یہ نہ اچھا ہے نہ برا یہ صرف فطرت ہے۔

انصاف، رحم اور اخلاقیات خالصتاً انسانی تصورات ہیں۔ موت کے بعد انصاف کا وعدہ انسان کی اپنی خواہش کت تخلیق ہے۔

مفتی شمائل ندوی: شر کا وجود خدا کی دلیل ہے۔

دنیا میں براءی اور ناانصافی کا وجود احتساب Accountability کے تصور کو جنم دیتا ہے۔ اگر برائی نہ ہوتی تو احتساب کا کوئی مطلب نہ ہوتا۔

یہ احتساب ایک اعلیٰ ترین منصف خدا کے وجدد کی طرف اشارہ کرتا ہے جو حتمی انصاف فراہم کرے گا۔

4.7 اخلاقی برتری: طنز کا جواب سکون سے

جاوید اختر کے طنز، استہزاء اور موضوعی انحراف کے مقابلے میں مفتی شمائل ندوی نے:

- آواز بلند نہیں کی
- ذاتی حملہ نہیں کیا
- مخاطب کی تضحیک نہیں کی

یہی اس مکالمے کی اصل فتح ہے۔

کیونکہ: جو سچ پر مطمئن ہوتا ہے، وہ چیختا نہیں — یہ اخلاقی سکون خود ایک دلیل بن جاتا ہے۔

4.8 باب کا خلاصہ

یہ باب واضح کرتا ہے کہ مفتی شمائل ندوی نے:

- خدا کو سائنسی شے نہیں بنایا
- عقل کو رد نہیں کیا
- Faith کو اندھا نہیں کہا
- بلکہ علم کی حدود متعین کیں

انہوں نے ثابت کیا کہ:

- اصل سوال "خدا ہے یا نہیں" نہیں
- اصل سوال "ہم جانتے کیسے ہیں" ہے

باب پنجم

مابعد الطبیعی حقیقت (Metaphysical Reality) اور دلیلِ امکان (Contingency Argument)

سوال کا درست میدان

اس مقام پر آکر ایک بنیادی غلط فہمی کو دور کرنا ناگزیر ہے۔ خدا کے وجود پر اکثر بحث اس جگہ ناکام ہو جاتی ہے جہاں غلط میدان منتخب کر لیا جاتا ہے۔ خدا کو تجربہ گاہ (Laboratory)، حواسِ خمسہ یا سائنسی آلات کے ذریعے ثابت یا رد کرنے کی کوشش دراصل ویسی ہی ہے جیسے: میٹل ڈیٹیکٹر سے پلاسٹک تلاش کرنا یہ ناکامی خدا کی نہیں، بلکہ پیمانے کے غلط انتخاب کی ناکامی ہے۔ یہ باب اسی غلطی کی جڑ پر وار کرتا ہے۔

5.1 Metaphysical Reality کیا ہے؟

Metaphysical Reality اس حقیقت کو کہتے ہیں جو:

- مادّہ (Matter) نہیں
- توانائی (Energy) نہیں
- وقت (Time) اور مکان (Space) کے اندر محدود نہیں

مگر اس کے باوجود:

- وہ حقیقت ہے
- وجود رکھتی ہے
- اثر ڈالتی ہے

مثال کے طور پر:

- عقل
- معنی
- اخلاق
- ریاضیاتی سچائیاں
- منطق کے اصول

یہ سب:

- نظر نہیں آتے
- لیبارٹری میں بند نہیں کیے جاسکتے

- مگر انکار بھی ممکن نہیں

خدا کا تصور اسی دائرے میں آتا ہے۔

لہٰذا:

خدا کا مسئلہ سائنسی نہیں، بلکہ **مابعد الطبیعی (Metaphysical)** ہے۔

5.2 Contingent Existence: ممکن الوجود کیا ہے؟

فلسفے کی زبان میں **Contingent Being** (ممکن الوجود) اس وجود کو کہتے ہیں جو:

1. خود سے قائم نہ ہو
2. نہ ہونا اس کے لیے ممکن ہو
3. اپنے وجود کے لیے کسی اور پر منحصر ہو

سادہ الفاظ میں:

وہ ہو بھی سکتا تھا، اور نہ بھی ہو سکتا تھا

مثال (سادہ مگر فیصلہ کن):

- سیب ← درخت کے بغیر نہیں
- درخت ← مٹی اور پانی کے بغیر نہیں
- مٹی ← سورج کے بغیر نہیں
- سورج ← نظامِ شمسی کے بغیر نہیں

یہ پورا سلسلہ ہمیں بتاتا ہے کہ: "ہر چیز کسی اور پر کھڑی ہے" یہی **Contingency** ہے انحصار۔

5.3 Contingency Argument: دلیلِ امکان

اب یہاں اصل سوال پیدا ہوتا ہے: "اگر ہر چیز کسی اور پر منحصر ہے"، تو یہ سلسلہ آخر رکے گا کہاں؟

Contingency Argument کہتی ہے:

1. کائنات کی ہر چیز Contingent ہے

2. Contingent چیز خود سے وجود میں نہیں آ سکتی
3. اگر سب کچھ Contingent ہو، تو کچھ بھی وجود میں نہ آ سکے
4. لہٰذا ایک ایسا وجود لازم ہے جو:
   - خود سے قائم ہو
   - کسی پر منحصر نہ ہو
   - جس کا نہ ہونا ممکن نہ ہو

اسی کو کہا جاتا ہے: **Necessary Being (واجب الوجود)**

5.4 Infinite Regress: لامتناہی سلسلہ کیوں ناممکن ہے؟

یہاں ناقد فوراً سوال کرتا ہے: "کیوں نہ یہ سلسلہ لامتناہی مان لیا جائے؟" یہیں **Infinite Regress** کا مسئلہ سامنے آتا ہے۔

مشہور مثال: امیگریشن کاونٹر

آپ ایئرپورٹ پر کھڑے ہیں۔ آپ کے آگے لوگوں کی قطار ہے، مگر:

- قطار کبھی ختم نہیں ہوتی

سوال:

کیا آپ کی باری کبھی آئے گی؟

جواب:

کبھی نہیں

اسی طرح:

- اگر ہر سبب کے پیچھے ایک اور سبب ہو
- اور یہ سلسلہ کبھی رکے ہی نہ

تو:

کوئی واقعہ کبھی رونما نہیں ہو سکتا

مگر:

- آپ موجود ہیں
- کائنات موجود ہے

لہٰذا:

سلسلہ کہیں نہ کہیں رکا ہے

5.5 Necessary Being: واجب الوجود کا تصور

وہ نقطہ جہاں سلسلہ رُکتا ہے، فلسفہ اسے کہتا ہے: **Necessary Being**

اس کی صفات:

- قائم بالذات
- غیر محتاج
- ازلی
- ابدی
- غیر مادی
- لا محدود

اہم بات:

یہ تصور مذہب نے نہیں، بلکہ **عقلِ محض** نے پیدا کیا ابنِ سینا، فارابی، ارسطو، اور بعد میں تھامس ایکویناس اسی نتیجے تک پہنچے۔

5.6 اعتراض: "یہ سب ذہنی تقسیم ہے"

یہاں جدید اعتراض سامنے آتا ہے: "ممکن الوجود اور واجب الوجود انسانی ذہن کی تقسیم ہے"۔ یہ اعتراض بظاہر گہرا لگتا ہے، مگر دراصل خود تضاد کا شکار ہے۔

کیونکہ:

- اگر ہر چیز ممکن ہے
- تو اس کا نہ ہونا بھی ممکن ہے

اور اگر سب کا نہ ہونا ممکن ہو،

تو:

کبھی کچھ ہوتا ہی نہیں

مگر:

- کچھ ہے
- اور یہ حقیقت انکار نہیں مانگتی

لہٰذا:

واجب الوجود کا انکار خود حقیقت کے انکار کے مترادف ہے

5.7 "لا محدود خدا بھی Contingent ہے؟" ایک فکری مغالطہ

کچھ لوگ کہتے ہیں: "اگر خدا لا محدود ہے تو وہ بھی ایک خاص وصف رکھتا ہے، لہٰذا وہ بھی Contingent ہوا"

یہ دلیل لفظوں کا کھیل ہے، حقیقت نہیں۔

کیونکہ:

- Contingency وصف سے نہیں
- انحصار سے ثابت ہوتی ہے

خدا:

- کسی پر منحصر نہیں
- اس لیے Contingent نہیں

لا محدود ہونا:

- محتاجی نہیں
- بلکہ بے نیازی کی علامت ہے

5.8 باب کا خلاصہ

یہ باب ثابت کرتا ہے کہ:

- خدا کا مسئلہ سائنسی نہیں Metaphysical ہے
- Contingency Argument کوئی مذہبی کہانی نہیں بلکہ عقل کی مجبوری ہے

اگر:

- کائنات Contingent ہے

تو:

- خدا Necessary Being ہے

باب ششم

خدا، وقت اور علت (God, Time & Causality)

غلط سوال، درست جواب کو کیوں روکتا ہے؟

خدا کے وجود پر ہونے والی بیشتر بحثیں **دلائل کی کمی** کی وجہ سے ناکام نہیں ہوتیں، بلکہ اس لیے ناکام ہو جاتی ہیں کہ سوال ہی **غلط فریم** میں پوچھا جاتا ہے۔ سب سے عام سوال یہی ہے: **"اگر خدا ہے، تو اسے کس نے پیدا کیا؟"**
یہ سوال بظاہر بہت منطقی محسوس ہوتا ہے، مگر حقیقت میں یہ ایک **Category Mistake** ہے۔
یہ باب اسی مغالطے کی تشریح اور تحلیل کے لیے وقف ہے۔

"خدا لیبارٹری میں کیوں نہیں؟" آخری غلط فہمی

6.1 Category Mistake کیا ہوتی ہے؟

جاوید اختر کا بار بار سوال: **"کوئی سائنسی ثبوت دکھاؤ"** یہ سوال خود **Category Mistake** ہے۔

کیوں؟

- **سائنس**: مادی، قابلِ تکرار چیزوں پر کام کرتی ہے
- **خدا**: **time**, **space**, **matter** سے ماورا

یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے:

- کسی شے کو
- ایسے دائرے (Category) میں رکھ کر
- سوال کیا جائے

جس دائرے میں وہ شے سرے سے آتی ہی نہیں

سادہ مثال:

- آپ کسی سے پوچھیں: "نیلا رنگ کتنا وزنی ہے؟"

یہ سوال:

- زبان کے اعتبار سے درست ہے
- مگر معنی کے اعتبار سے بے معنی

کیونکہ:

وزن رنگ کی **Category** نہیں

اسی طرح:

- میٹل ڈیٹیکٹر سے پلاسٹک ڈھونڈنا
- تھرمامیٹر سے رنگ ناپنا

غلط ٹول ← غلط نتیجہ

اسی طرح:

"خدا کب پیدا ہوا؟"

یہ سوال بھی:

- وقت (Time) کی Category
- خدا پر لاگو کر رہا ہے

جبکہ:

خدا وقت کا خالق ہے، وقت کے اندر موجود نہیں

6.2 وقت (Time) کیا ہے؟

یہاں ایک بنیادی حقیقت سمجھنا ضروری ہے:

وقت:

- کوئی آزاد شے نہیں
- بلکہ واقعات کی ترتیب کا نام ہے

سائنس کے مطابق:

- وقت کا آغاز **Big Bang** کے ساتھ ہوا
- وقت مادّے اور توانائی سے جڑا ہوا ہے

لہٰذا:

وقت مخلوق ہے

اور جو مخلوق ہے:

- اس کا آغاز ہوتا ہے
- اس پر "کب" کا سوال درست ہوتا ہے

6.3 خدا اور وقت کا تعلق

اگر:

- خدا وقت کا خالق ہے

تو:

- خدا وقت سے ماورا ہے

اس کا مطلب یہ نہیں کہ:

- خدا "بے وقت" ہے

بلکہ:

خدا پر وقت کا اطلاق ہی نہیں ہوتا

لہٰذا:

"خدا کب تھا؟"

یا

"خدا سے پہلے کیا تھا؟"

یہ دونوں سوال:

- Category Mistake ہیں

6.4 علت (Cause) اور وقت کا فرق

یہاں ایک اور اہم مغالطہ جنم لیتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں: "ہر چیز کا سبب ہوتا ہے، تو خدا کا سبب کیا ہے؟"

یہاں دو چیزیں خلط ملط کر دی جاتی ہیں:

1. Temporal Cause

(وقت کے اندر سبب)

2. Ontological Cause

(وجودی سبب)

خدا:

- زمانی سبب کا محتاج نہیں
- کیونکہ وہ وقت میں نہیں

مگر:

- وہ کائنات کا وجودی سبب ہے

یہ فرق نہ سمجھنے کی وجہ سے: خدا پر وہ اصول لاگو کر دیے جاتے ہیں، جو صرف مخلوق پر لاگو ہوتے ہیں

6.5 "Infinite Past" کا مسئلہ

کچھ لوگ کہتے ہیں: "کائنات ازل سے ہے، خدا کی ضرورت نہیں" ۔ یہ دعویٰ فلسفیانہ طور پر ناقابلِ دفاع ہے۔

کیونکہ:

- اگر ماضی لامتناہی ہو
- تو حال کبھی نہیں آ سکتا

یہی وہی مسئلہ ہے جو:

- Infinite Regress میں سامنے آیا

اگر:

- واقعات کی قطار کبھی شروع ہی نہ ہوئی

تو:

- آج کا دن کبھی نہ آتا

مگر:

- آج موجود ہے

لہٰذا:

ماضی لامتناہی نہیں

6.6 Big Bang اور فلسفہ

سائنس کہتی ہے:

- **کائنات کا آغاز ہے**

فلسفہ کہتا ہے:

- **جس چیز کا آغاز ہو**
- **وہ خود سے نہیں ہو سکتی**

یہاں:

- **سائنس رُکتی ہے**
- **فلسفہ بولتا ہے**

اور فلسفہ کہتا ہے:

آغاز ← سبب ← غیر زمانی سبب، یہی **خدا** ہے۔

6.7 "اگر خدا خود کو دلیل سے منوانا چاہتا..."

یہ اعتراض اکثر جذباتی انداز میں آتا ہے: **"اگر خدا چاہتا تو سب کو دلیل سے قائل کر دیتا"**۔ یہ بات خدا کی نہیں، انسان کی **غلط توقع** کی عکاسی ہے۔

خدا: "انسان کو مجبور نہیں کرتا، بلکہ اختیار دیتا ہے"

اگر خدا:

- ناقابلِ انکار سائنسی مظہر ہوتا

تو:

- ایمان کا کوئی مفہوم نہ رہتا

ایمان:

علم اور اختیار کے درمیان کھڑا فیصلہ ہے

6.7.1 Reason (عقل) کیا ہے اور اس کی حدود کیا ہیں؟

عقل (Reason) انسان کی وہ صلاحیت ہے جس کے ذریعے وہ: تعلقات قائم کرتا ہے، نتائج اخذ کرتا ہے اور دلائل کو جوڑتا اور پرکھتا ہے۔ عقل نہایت طاقتور آلہ ہے، مگر **مطلق نہیں**۔

عقل کی طاقت:

- ریاضی، منطق، سائنس، فلسفہ

عقل کی حدود:

عقل ان چیزوں کو سمجھنے میں محدود ہے:

- جو تجربے سے باہر ہوں
- جو خود عقل کی بنیاد ہوں

مثالیں:

- عقل خود کو ثابت نہیں کر سکتی
- منطق، منطق کو تجربے سے درست نہیں ٹھہرا سکتی
- شعور کو شعور کے اندر رکھ کر ناپا نہیں جا سکتا

یعنی:

عقل بہترین ٹول ہے، مگر آخری عدالت نہیں۔ یہی وہ نکتہ ہے جسے جاوید اختر نظر انداز کرتے ہیں۔

6.7.2 Faith (ایمان) کیا ہے؟ کیا یہ عقل کے خلاف ہے؟

عام طور پر **Faith** کو یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ: "آنکھ بند کر کے مان لینا"۔ یہ تصور خود **غلط فہمی** ہے۔

Faith کی درست تعریف:

Faith کا مطلب ہے:

- عقل کی رہنمائی میں
- مگر عقل سے آگے جا کر
- معنی (Meaning) کو قبول کرنا

Faith :

- عقل کا دشمن نہیں
- بلکہ عقل کے بعد کا مرحلہ ہے

مثال:

- آپ محبت کو ثابت نہیں کر سکتے
- مگر محبت کو جھٹلا بھی نہیں سکتے

یہی حال:

- اخلاق
- مقصدِ حیات
- خیر و شر
- زندگی کے معنی

یہ سب **Faith** کے دائرے میں آتے ہیں۔

6.8 عقل کی حد اور Faith کی ابتدا

یہ باب یہاں آکر ایک نکتہ واضح کرتا ہے: عقل ایک عظیم نعمت ہے۔ مگر وہ لا محدود نہیں

جب عقل:

- حدود پر پہنچتی ہے

تو:

- Faith شروع ہوتا ہے

یہ Faith:

- عقل کا انکار نہیں
- بلکہ اس کی تکمیل ہے

6.8.1 جاوید اختر کا موقف: "میں وہی مانتا ہوں جو عقل مانتی ہے"

ظاہری طور پر یہ جملہ بہت مضبوط لگتا ہے، مگر فلسفیانہ طور پر یہ کئی مسائل رکھتا ہے۔

بنیادی سوال:

کون سی عقل؟

- سائنسی عقل؟
- تجرباتی عقل؟
- منطقی عقل؟
- شخصی عقل؟

جاوید اختر دراصل: **Empirical Reason** کو واحد معیار بنا دیتے ہیں جبکہ یہ خود ایک **غیر سائنسی مفروضہ** ہے۔

کیونکہ:

- Empirical Reason خود empirically ثابت نہیں

یہاں وہ ایک منطقی مغالطہ کرتے ہیں:

Category Error

یعنی:

- Metaphysical سوال کا Physical ٹول سے جواب مانگنا۔

یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے: میٹل ڈیٹیکٹر سے پلاسٹک ڈھونڈنا۔ ناکامی ٹول کی ہوتی ہے، چیز کی نہیں۔

6.8.2 "God of the Gaps" یا "Ignorance" کا الزام

جاوید اختر کا ایک عام طنزیہ نکتہ یہ ہوتا ہے: "جہاں عقل ختم، وہاں خدا رکھ دیا"

مفتی شمائل ندوی نے یہاں نہایت اہم فلسفیانہ فرق واضح کیا:

Ignorance Argument : "مجھے نہیں معلوم، اس لیے خدا"

Islamic Philosophical Position :

- "یہ معلوم ہے کہ **Contingent** ہے، اس لیے **Necessary Being** " یہ فرق نہایت بنیادی ہے۔

خدا:

- علم کی کمی کی جگہ نہیں
- بلکہ وجود کی بنیاد ہے
-

6.9 باب ششم کا خلاصہ

یہ باب ثابت کرتا ہے کہ:

- "خدا کو کس نے پیدا کیا؟"

  ایک غلط سوال ہے
- خدا وقت کا خالق ہے

  وقت کے اندر نہیں
- Cause اور Time کو خلط ملط کرنا

  بنیادی مغالطہ ہے
- Big Bang خدا کی نفی نہیں

  بلکہ اس کی طرف اشارہ ہے

اختتامی کلمات

یہ کتاب کسی کو خاموش کرانے کے لیے نہیں لکھی گئی، بلکہ **سوچ کو بیدار کرنے** کے لیے لکھی گئی ہے۔

اگر پڑھنے والا:

- خدا کو مان لے

تو:

- یہ زبردستی نہیں

اور اگر:

- نہ مانے

تو:

- یہ دشمنی نہیں

اصل کامیابی یہ ہے کہ: "سوال سچائی سے پوچھا جائے"

اور جواب انا کے بغیر سنا جائے، عقل اور ایمان دشمن نہیں، یہ دو آنکھیں ہیں، جن سے انسان حقیقت کو مکمل دیکھتا ہے۔

مذہب کے عملی نتائج کا فکری جائزہ

خدا کے وجود پر فلسفیانہ بحث جب اپنے منطقی مراحل طے کر لیتی ہے، تو ایک ناگزیر سوال سامنے آتا ہے: **اگر خدا اور مذہب کو مان لیا جائے، تو اس کا انسانی معاشرے پر کیا اثر پڑتا ہے؟**

یہ سوال محض نظری نہیں بلکہ عملی، اخلاقی اور تہذیبی نوعیت کا ہے۔ اسی مقام پر جاوید اختر مذہب کو فرد کے باطن سے نکال کر سماج کے کٹہرے میں کھڑا کرتے ہیں۔

جاوید اختر کا اعتراض: مذہب اور سماجی بگاڑ

جاوید اختر کے نزدیک مذہب کا اصل مسئلہ اس کے ماننے والوں کے دلوں میں نہیں بلکہ معاشروں میں ظاہر ہوتا ہے۔ ان کے مطابق تاریخ گواہ ہے کہ:

- مذہب نے انسانوں کو گروہوں میں تقسیم کیا،
- فرقہ واریت اور تعصب کو ہوا دی،
- جنگوں اور تشدد کو اخلاقی جواز فراہم کیا،
- اور آزاد فکر کو دبانے کا ذریعہ بنا۔

وہ اس نکتے پر زور دیتے ہیں کہ:

اگر مذہب واقعی خدائی ہدایت ہوتا، تو اس کے اثرات انسانیت کے لیے اتنے متضاد کیوں نظر آتے؟

ان کے نزدیک:

- اخلاقیات مذہب کی محتاج نہیں،
- انسان ہمدردی، انصاف اور خیر کو خود دریافت کر سکتا ہے،
- اور مذہب اکثر طاقت کے مراکز کے ہاتھ میں ایک آلہ بن جاتا ہے۔

یہ اعتراض جذباتی نہیں بلکہ تاریخی تجربے سے جڑا ہوا دکھائی دیتا ہے، اسی لیے یہ سنجیدگی سے سنا جانا چاہیے۔

مفتی شمائل ندوی کا بنیادی فرق: اصول اور استعمال

مفتی شمائل ندوی اس اعتراض کو رد کرنے کے بجائے ایک بنیادی **تصوری فرق** واضح کرتے ہیں:

مذہب بذاتِ خود کیا کہتا ہے اور مذہب کے نام پر انسان کیا کرتا ہے۔ یہ دونوں ایک نہیں ہیں۔

وہ مثال دیتے ہیں:

- آگ روشنی بھی دیتی ہے اور جلا بھی سکتی ہے،
- مگر آگ کا کام جلانا نہیں،
- بلکہ استعمال کرنے والے کی نیت اور طریقہ فیصلہ کن ہوتا ہے۔

اسی طرح:

- مذہب کا مقصد ہدایت ہے،
- مگر جب اسے اقتدار، انا یا خوف کے ساتھ جوڑ دیا جائے،
- تو وہ بگاڑ کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

یہ بگاڑ مذہب کی نفی نہیں بلکہ مذہب سے انحراف کی علامت ہے۔

مذہب بطور اخلاقی ضابطہ

مفتی شمائل ندوی کے مطابق مذہب کی اصل سماجی اہمیت یہاں سے شروع ہوتی ہے:

- مذہب اخلاق کو محض سماجی معاہدہ نہیں رہنے دیتا،
- بلکہ اسے **اخلاقی ذمہ داری** بنا دیتا ہے۔
- وہ طاقتور کو بھی جواب دہ بناتا ہے،
- اور کمزور کو محض قانون نہیں بلکہ عدلِ مطلق کی امید دیتا ہے۔

وہ سوال اٹھاتے ہیں: اگر انسان خود ہی اخلاق کا آخری معیار ہے، تو ظالم کو رکنے کی کیا وجہ ہے؟ اور مظلوم کو آخری انصاف کی امید کیوں ہو؟

یہاں مذہب سماج میں **ضمیر کی عدالت** قائم کرتا ہے، جو قانون کی عدم موجودگی میں بھی انسان کو روک سکتی ہے۔

تاریخ کا متوازن مطالعہ

یہ کہنا کہ مذہب نے صرف نقصان پہنچایا، تاریخی طور پر یک رُخی تجزیہ ہے۔

اسی مذہب نے:

- غلاموں کو انسان ماننے کا تصور دیا،
- عورت، یتیم اور کمزور کو اخلاقی تحفظ فراہم کیا،
- خیرات، تعلیم اور خدمتِ خلق کے ادارے قائم کیے،
- اور انسان کو محض فائدہ نہیں، فرض کا شعور دیا۔

مسئلہ مذہب کا نہیں، مسئلہ انسان کے اختیار اور نیت کا ہے۔

رحمت یا زحمت؟ ایک متوازن نتیجہ

یہ باب ہمیں اس نتیجے تک پہنچاتا ہے کہ:

- مذہب اپنی اصل میں رحمت ہے،
- مگر انسان کے ہاتھ میں آ کر زحمت بھی بن سکتا ہے۔

جیسے:

- قانون انصاف کے لیے بنتا ہے،
- مگر غلط استعمال میں ظلم بن جاتا ہے،

اسی طرح:

- مذہب ہدایت کے لیے آتا ہے،
- مگر جہالت اور اقتدار اسے بگاڑ دیتے ہیں۔

اختتامی تاثر

جاوید اختر مذہب کو اس کے تاریخی مظاہر سے پرکھتے ہیں، مفتی شمائل ندوی مذہب کو اس کے **اصولی دعوے** سے جانچتے ہیں۔

یہ Case Study ہمیں سکھاتی ہے کہ:

- اصل سوال یہ نہیں کہ مذہب ناکام ہوا یا نہیں،
- بلکہ یہ ہے کہ انسان مذہب کے ساتھ کیا کرتا ہے۔

یہ باب ہمیں اگلے مرحلے کی طرف لے جاتا ہے: **انصاف، اخلاق اور آخرت۔ سماجی نظم کی آخری بنیاد**

اختتامی باب

عقل، ایمان اور مکالمہ، ایک فکری بازگشت

یہ کتاب کسی ایک شخص کو قائل کرنے، کسی مخصوص مکتبِ فکر کو برتر ثابت کرنے، یا کسی مناظرانہ فتح کا اعلان نہیں ہے۔ اس کا اصل مقصد ایک قدم پیچھے ہٹ کر یہ دیکھنا ہے کہ ہم **سوچتے کیسے ہیں**، **سوال کیوں اٹھاتے ہیں**، اور **جوابات کس بنیاد پر قبول یا رد کرتے ہیں**۔

خدا کے وجود پر بحث کوئی نئی نہیں۔ یہ بحث انسان کے شعور کے ساتھ ہی جنم لیتی ہے، کیونکہ انسان محض دیکھنے والا نہیں، بلکہ معنی تلاش کرنے والا وجود ہے۔ وہ صرف یہ نہیں پوچھتا کہ **کیا** ہے، بلکہ یہ بھی جاننا چاہتا ہے کہ **کیوں ہے**۔ یہی سوال فلسفے کو جنم دیتا ہے، یہی سوال مذہب کی بنیاد بنتا ہے، اور یہی سوال **عقل** کو اس کی حدوں تک لے جاتا ہے۔

اس کتاب میں جاوید اختر اور مفتی شمائل ندوی کے مکالمے کو بطور **Case Study** پیش کیا گیا۔ اس لیے نہیں کہ ایک کو درست اور دوسرے کو غلط ثابت کیا جائے، بلکہ اس لیے کہ دونوں کی گفتگو کے ذریعے یہ واضح ہو سکے کہ اختلاف کہاں **علمی** ہے اور کہاں **فکری** مغالطے جنم لیتے ہیں۔

ہم نے دیکھا کہ جب **عقل** اپنے دائرے سے نکل کر ہر شے کا واحد پیمانہ بننے لگتی ہے، تو وہ خود ایک **غیر ثابت شدہ عقیدہ** میں بدل جاتی ہے۔ اور جب ایمان **عقل** سے بے نیاز ہو کر سوال سے **فرار** اختیار کرے، تو وہ محض روایت بن کر رہ جاتا ہے۔

یہاں اصل مسئلہ **خدا** کے ہونے یا نہ ہونے سے پہلے یہ ہے کہ ہم **وجود** کو کس زاویے سے دیکھتے ہیں۔

کیا ہر وہ شے جو موجود ہے، خود بخود موجود ہے؟

کیا **علتوں** کا لامتناہی سلسلہ واقعی **مسئلے** کو حل کر دیتا ہے، یا صرف اسے پیچھے دھکیل دیتا ہے؟

اور اگر ہر شے **ممکن** الوجود ہے۔ یعنی ہو بھی سکتی تھی، **نہ** بھی ہو سکتی تھی۔ تو پھر آخر وہ کون سا وجود ہے جو خود اپنے ہونے کی **وجہ** رکھتا ہے؟

فلسفہ اسی مقام پر **Necessary Being** کا تصور پیش کرتا ہے۔ نہ بطور مذہبی نعرہ، بلکہ بطور عقلی ضرورت۔ یہ تقسیم انسانی ذہن کی اختراع نہیں، بلکہ خود حقیقت کی ساخت سے پھوٹتی ہے۔ ممکن اور واجب کا فرق نہ مانا جائے، تو سوال ختم نہیں ہوتے؛ بلکہ اور زیادہ الجھ جاتے ہیں۔

خدا کو ماننا، عقل کا انکار نہیں بلکہ عقل کے غرور سے نجات ہے۔ جاوید اختر عقل کے مسافر ہیں مگر حد پر رک گئے. مفتی شمائل ندوی: حد پہ رک کر آگے جھانکنے کی دعوت دیتے ہیں۔ یہی فرق ہے۔

اس کتاب کا ایک اہم سبق یہ بھی ہے کہ **ہر سوال کا جواب ایک ہی علم سے نہیں ملتا**۔ مذہب سے سائنسی تفصیلات مانگنا، یا سائنس سے مابعد الطبیعی معنی طلب کرنا، دونوں صورتوں میں ہم علم کے ساتھ ناانصافی کرتے ہیں۔ حقیقی عقل وہی ہے جو علم کو اس کی حدود میں رکھ کر استعمال کرے، اور حقیقی ایمان وہی ہے جو سوال سے خوف زدہ نہ ہو۔

آخر میں، یہ کتاب پڑھنے والوں کو کسی حتمی نتیجے پر مجبور نہیں کرتی، بلکہ ایک دعوت دیتی ہے:

سوچنے کی دعوت،
سوال کو دیانت داری سے اٹھانے کی دعوت،
اور اختلاف کو مکالمے میں بدلنے کی دعوت۔
کیونکہ مسئلہ یہ نہیں کہ ہم کیا مانتے ہیں،
اصل مسئلہ یہ ہے کہ **ہم مانتے کیسے ہیں**۔

اگر یہ کتاب پڑھنے والے کو ایک لمحے کے لیے بھی اپنی فکری عادتوں پر نظرِ ثانی پر آمادہ کر دے۔ تو یہی اس کا سب سے بڑا حاصل ہے۔

Appendix

Common Logical Fallacies in God Debates

(خدا کے وجود پر مباحث میں عام منطقی مغالطے)

یہ Appendix اس مقصد کے لیے شامل کیا جارہا ہے کہ پڑھنے والے کو یہ سمجھایا جاسکے کہ خدا کے وجود پر ہونے والی بہت سی بحثیں دراصل دلائل کی کمی کی وجہ سے نہیں بلکہ منطقی مغالطوں (Logical Fallacies) کی وجہ سے غیر نتیجہ خیز ہو جاتی ہیں۔ ذیل میں چند اہم اور عام مغالطوں کا جائزہ پیش کیا جارہا ہے:

1. Absence of Evidence is Evidence of Absence

(عدمِ ثبوت کو عدمِ وجود کی دلیل سمجھنا)

یہ سب سے عام مغالطہ ہے۔

دعویٰ: "چونکہ خدا کا کوئی سائنسی یا تجرباتی ثبوت نہیں، اس لیے خدا موجود نہیں۔"

مسئلہ: کسی شے کا تجرباتی ثبوت نہ ہونا اس کے عدمِ وجود کی دلیل نہیں بنتا، خاص طور پر جب وہ شے Metaphysical Reality سے تعلق رکھتی ہو۔

مثال: عقل، محبت، شعور، اخلاقیات۔ ان میں سے کوئی بھی لیبارٹری میں ناپی نہیں جاسکتی، لیکن ان کے وجود سے انکار بھی ممکن نہیں۔

2. Category Mistake

(غلط خانے میں پرکھنا)

دعویٰ: "اگر خدا ہے تو وہ کہاں ہے؟ کس شکل میں ہے؟ کس وقت پیدا ہوا؟"

مسئلہ: یہ سوالات مادی اشیاء کے لیے درست ہیں، غیر مادی حقیقت کے لیے نہیں۔ خدا کو time, space اور matter کے زمرے میں رکھ کر پرکھنا ایک Category Error ہے۔

3. God of the Gaps (الٹا استعمال)

(نامعلوم کو فوراً خدا کہہ دینا یا ہر خدائی دلیل کو اسی خانے میں ڈال دینا)

بعض ناقدین ہر مابعدالطبیعی دلیل کو فوراً "God of the Gaps" کہہ کر مسترد کر دیتے ہیں، حالانکہ:

- Contingency Argument

- Necessary Being
- Infinite Regress

یہ سائنسی خلا نہیں بلکہ **فلسفیانہ استدلال** ہیں۔

4. Straw Man Fallacy

(مخالف کے موقف کو بگاڑ کر رد کرنا)

مثال: "مذہب کہتا ہے ہر چیز کا جواب مذہبی کتاب میں ہے، اس لیے سائنس کی ضرورت نہیں۔"

حالانکہ سنجیدہ مذہبی موقف یہ نہیں کہتا۔ مذہب کا موضوع اخلاق، مقصد اور معنی ہے، نہ کہ سائنسی تفصیلات۔

5. False Analogy

(غلط مثال سے نتیجہ نکالنا)

مثال کے طور پر خدا کو **Russell's Teapot** سے تشبیہ دینا:

- چائے دانی ایک **contingent**، مادی اور محدود شے ہے
- خدا **Necessary**، غیر مادی اور ماورائے فطرت تصور کیا جاتا ہے

دونوں کا تقابل ہی غلط ہے۔

6. Emotional Reasoning

(جذبات کو دلیل بنانا)

مثال: "اگر خدا ہوتا تو دنیا میں اتنا دکھ نہ ہوتا، اس لیے خدا نہیں۔"

یہ دلیل منطق پر نہیں بلکہ جذباتی ردِ عمل پر قائم ہے۔

خلاصہ (Appendix Conclusion)

خدا کے وجود پر بحث میں اصل رکاوٹ دلائل کی کمی نہیں، بلکہ **دلائل کے غلط استعمال** ہیں۔ جب تک مکالمہ منطقی اصولوں کا پابند نہ ہو، وہ شور تو پیدا کر سکتا ہے، روشنی نہیں۔

Epilogue

Why Disbelief is also a Worldview

(انکارِ خدا بھی ایک فکری موقف ہے)

یہ کیس اسٹیڈی خدا کے وجود پر کسی حتمی فیصلے کے لیے نہیں لکھی گئی، بلکہ ایک اہم غلط فہمی کی نشاندہی کے لیے لکھی گئی ہے: یہ خیال کہ **ایمان ایک worldview ہے لیکن انکار غیر جانبدار پوزیشن ہے۔**

حقیقت یہ ہے کہ: **خدا کا انکار بھی ایک مکمل فکری موقف (Worldview) ہے۔**

1. Neutrality کا مغالطہ

اکثر کہا جاتا ہے: "ہم خدا کا انکار نہیں کر رہے، بس ثبوت مانگ رہے ہیں۔"

لیکن جب نتیجہ پہلے ہی طے ہو کہ: "جب تک تجرباتی ثبوت نہ ہو، میں نہیں مانوں گا"

تو یہ خود ایک Epistemological Commitment ہے، یعنی علم کو صرف ایک خاص ذریعہ تک محدود کرنا۔

2. Disbelief کے مضمرات

خدا کے انکار کے ساتھ چند لازمی نتائج جڑے ہوتے ہیں:

- اخلاقیات کی کوئی حتمی بنیاد نہیں
- انصاف ایک سماجی معاہدہ بن جاتا ہے
- زندگی کا کوئی ماورائی مقصد نہیں رہتا
- موت آخری حقیقت بن جاتی ہے

یہ سب **فلسفیانہ نتائج** ہیں، محض سائنسی نہیں۔

3. Faith vs Blind Faith

یہ کتاب Blind Faith کی وکالت نہیں کرتی۔

لیکن یہ ضرور کہتی ہے کہ:

- Faith = Meaning-based commitment
- Disbelief = Meaning-less or self-created meaning

دونوں میں سے کوئی بھی خالی نہیں۔

4. آخری Reflection

یہ مکالمہ ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ اصل سوال یہ نہیں: "کون جیتا؟"

بلکہ اصل سوال یہ ہے: "ہم نے کیا سیکھا؟"

عقل اور وحی کا تعلق دشمنی کا نہیں، تکمیل کا ہے۔ جہاں عقل رکتی ہے، وہیں وحی بولتی ہے اور جہاں وحی بولتی ہے، وہاں عقل خاموش نہیں ہوتی، بلکہ سر جھکاتی ہے۔

اختتامی جملہ (Final Line of the Book)

یہ کتاب جواب نہیں دیتی، آئینہ دکھاتی ہے۔ جو اس میں خود کو پہچان لے، وہی اس کا اصل پڑھنے والا ہے۔



عقل اور وحی عصرِ حاضر کے ایک بنیادی فکری سوال کا سنجیدہ اور متوازن مطالعہ ہے:
کیا انسانی عقل حتمی حقیقت تک رسائی کے لیے کافی ہے، یا وحی ایک ناگزیر رہنمائی فراہم کرتی ہے؟

یہ کتاب جاوید اختر اور مفتی شمائل ندوی کے مابین ہونے والے ایک معاصر فکری مکالمے کو محض نقل نہیں کرتی، بلکہ اسے ایک بامعنی Case Study کی صورت میں پیش کرتی ہے۔ یہاں خدا کے وجود، اخلاقیات، انصاف، علم و لاعلمی، بارِ ثبوت، اور سائنس و مذہب کے باہمی تعلق جیسے موضوعات کو عقلی، فلسفیانہ اور تہذیبی تناظر میں پرکھا گیا ہے۔

مصنف نے نہ تو کسی فریق کی غیر مشروط وکالت کی ہے اور نہ ہی قاری پر کوئی نتیجہ مسلط کیا ہے۔ اس کے بجائے، دلائل کی منطقی ساخت، سوالات کی گہرائی، اور فکری اختلاف کی تہذیب کو اس انداز سے مرتب کیا گیا ہے کہ قاری خود سوچنے، پرکھنے اور نتیجہ اخذ کرنے پر آمادہ ہو۔
یہ کتاب اُن قارئین کے لیے ہے جو: سوال سے خوفزدہ نہیں، اختلاف کو فکری ارتقا سمجھتے ہیں اور ایمان و انکار کے بیچ موجود فکری خلا کو سمجھنا چاہتے ہیں۔
عقل اور وحی نہ مناظرہ ہے، نہ خطبہ یہ ایک دعوتِ فکر ہے۔